ہم نفسانِ رفتہ

اچھی کتاب
کا
نکھار ہمیشہ
قائم
رہتا ہے

ہم نفسانِ رفتہ

پروفیسر رشید احمد صدیقی
ریسرچ پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

آئینۂ ادب، چوک مینار، انارکلی لاہور

۱۹۹۰ء

تعداد ۵۰۰

قیمت -/[redacted] روپے

اہتمام

م، ع، سلام - آئینۂ ادب

چوک مینار - انارکلی

لاہور

فون نمبر: ۶۷۵۰۴

طفیل آرٹ پرنٹرز - لاہور

فہرست

۱۔ جناب شفیق الرحمٰن قدوائی ۹
۲۔ مولانا سید سلیمان ندوی .
۳۔ افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق .
۴۔ نواب محمد اسمٰعیل خاں .
۵۔ مولانا ابوالکلام آزاد .
۶۔ پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس .

۷ ۔ کندن .

۸ ۔ بابائے اردو عبدالحق .

۹ ۔ حضرت جگر مراد آبادی .

۱۰ ۔ پنڈت جواہر لال نہرو .

اے ہم نفسانِ محفلِ ما
رفتید ولے نہ از دلِ ما

فیضی

شفیق الرحمن قدوائی

جامعہ کے جن عزیزوں سے میرا پرانا اور گہرا تعلق رہا ہے ان میں شفیق صاحب بھی تھے، ان سے ملاقات کم ہوتی تھی، بس یوں ہی سال دو سال میں ایک آدھ بار، وہ بھی چلتے پھرتے۔ آخر میں جب ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور شفیق صاحب دہلی اسٹیٹ کے وزیر تعلیمات ہوئے تو ملنے کے مواقع بڑھ گئے، پھر تو تعلقات کچھ ایسے ہو گئے کہ کوئی تردد ہوتا یا خوشی میسر آئی تو شفیق صاحب ضرور یاد آتے اور کچھ ایسا لگتا جیسے وہ شریک ہو جاتے تو تردد کم اور خوشی زیادہ ہو جاتی۔

کبھی ملاقات ہو جاتی تو بڑی خوشی ہوئی۔ اس طرح کی خوشی جو خلوص اور ریاضت کا نتیجہ ہوتی ہے اتفاقات کا نہیں ہیں شفیق صاحب کو اپنا کارنامہ سمجھتا، جس کی زندگی کے نقشے میں کارنامہ کا خانہ خالی ہو اس کے نزدیک معمولی سے معمولی کارنامہ کا احساس بھی بڑے فخر و مسرّت کا باعث ہوتا ہے چہ جائیکہ وہ کارنامہ اتنا بڑا ہو جتنا کہ شفیق صاحب۔ لکھنے کو تو میں یہ لکھ گیا، لیکن یہ بات بھی فوراً ہی ذہن میں آئی کہ شفیق صاحب کس کا کارنامہ نہ تھے

میں زندگی کی مادی راحتوں اور جسمانی لذّتوں کا خاصا دلدادہ رہا۔ اب بھی اُن سے تائب نہیں ہوا ہوں کبھی کبھی یہ بھی محسوس کیا ہے کہ زندگی کے مصائب و مکروہات جن کا ماتم اکثر کیا جاتا ہے ۔ ان راحتوں اور لذّتوں کے ہوتے ہوئے آسانی سے سہے جا سکتے ہیں۔ ذہنی آسودگی کا مدار، اچھی خاصی حد تک (مجھ دنیا دار کے نزدیک) مادّی راحتوں اور جسمانی لذّتوں پر ہے لیکن میں خاصا شرمندہ ہوا ہوں اپنے آپ سے جب سامنا ایسے لوگوں کا ہوا جنہوں نے اپنی زندگی پر ان مصائب و مکروہات کو حلال اور راحتوں اور لذّتوں کو حرام کر رکھا تھا۔ ان میں جان پہچان کے لوگوں میں بار بار ذاکر صاحب اور شفیق صاحب آئے ہیں۔ اُنھوں نے معلوم نہیں کس دھن میں شاید کبھی سوچا تک نہیں کہ جوانی، دولت اور شان شوکت کے کیا مزے تھے جس مزے میں وہ گُم تھے، وہ میرے اور میرے جیسے راحت پسندوں کے لئے کس قدر کڑوا ہوگا اس کا اندازہ کچھ اس شرمندگی سے کیا جا سکتا ہے جو ان دونوں کے سامنے میں نے ہمیشہ محسوس کی ہے۔ اور تن آسانی کا میرا جیسا خوگر ایسا کون ہے جو محسوس نہ کرے گا!

شفیق الرحمٰن دہلی اسمبلی کے وزیر تعلیم ہوئے اور وہ فراغت نصیب ہوئی جو وہ چاہتے رہے ہوں یا نہیں میں چاہتا تھا اور ہمیشہ سے چاہتا تھا کہ ان کو نصیب ہو۔ لیکن وہ ان فراغتوں میں کبھی نہ بدلے اور یہی نہیں کہ نہیں بدلے بلکہ ان کی خوبیاں اور نکھر گئیں۔ دولت اور فراغت کے خلاف ہونا آرٹ، ادب، زندگی اور اس طرح کی دوسری باتوں کے صحیح و صالح تصوّر کے لئے آج کل ضروری خیال کیا جانے لگا ہے۔ میں اس کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں، آرٹ، ادب، امیری غریبی وغیرہ کے بارے میں میرا کچھ ایسا خیال ہے جیسے

وہ میرے لئے ہوں نہ کہ میں ان کے لئے۔ امیری ہو یا غریبی افراد کی زندگی پر ان کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی بھلانے کی نہیں کہ افراد کی زندگی کا امیری غریبی پر بھی بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ آرٹ اور ادب اشخاص پر معمولی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن غیر معمولی شخص سے آرٹ اور ادب زیر و زبر ہو جاتے ہیں۔ زندگی اپنا چولا افراد میں بدلتی ہے جماعت میں نہیں۔ جماعت اختراع و انقلاب سے معصوم ہوتی ہے۔ اختراع و انقلاب صرف افراد کا حصہ ہے۔ دولت اور فراغت سے اشخاص بدلتے نہیں بے نقاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ فراغت سے قریں ہو کر شفیق صاحب کی شخصیت کے بہت سے دل آویز پہلو جو پہلے سایہ میں تھے اب روشنی میں آ گئے تھے۔

کبھی کوئی ایسی ہی بات آن پڑتی ہے تو میں دہلی جاتا ہوں لیکن یہ جانا ہوتا ہے بڑے جبر سے۔ جسے میں اس بہانے گوارا کر لیتا ہوں جیسے یہ جانا صرف واپس آنے کے لئے تھا۔ شفیق صاحب اِس فکر میں رہتے کہ میں کبھی ان کے مکان پر ٹھہروں جہاں وہ میری خاطر مدارات جی بھر کر کر سکیں، اس سے میں بچنا چاہتا تھا، میں جانتا ہوں کہ ان کا ایک ایک لمحہ اس طرح کی خاطر مدارات کے کام سے کہیں بہتر کاموں کے لئے وقف ہے۔ مہمان بننے سے میں یوں بھی گھبراتا ہوں، مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے میں کھاتا پیتا ہنستا بولتا مہمان نہیں ہوں بلکہ اس دنیا میں چند دنوں کا مہمان رہ گیا ہوں اور لوگ خاطر مدارات کر کے اتنا خوش ہو رہے ہیں جتنا کسی مریض یا مسافر کی خدمت کر کے ثواب کمانے کی فکر میں ہوں۔ میرے دل میں یہ بات بیٹھ سی گئی ہے کہ کوئی بھلا مانس مہمان ضرورت سے زیادہ خاطر مدارات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ معمول یہ تھا کہ میں اپنے آنے کی اطلاع ٹیلیفون پر کر کے دعا سلام کر لیتا

ایک مرتبہ ٹیلیفون ہی پر بھڑنے نہ بھڑنے پر رد و قدح ہوتی رہی۔ میں نے ان کی بات مان لی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اُن کے آفس پہنچ گیا۔ بولے یہ کیا حرکت ہے۔ میں نے کہا بات یہ تھی کہ میں نے تمام عمر آپ کو گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے دیکھا اور خدا جانے جھوٹ یا سچ بعضوں نے مانگتے کھاتے بھی دیکھا ہے۔ آج یہ خیال آیا کہ ذرا وزارتِ تعلیمات کی کرسی پر آپ کی چھب تختی دیکھ آؤں۔ بڑے زور سے ہنسے اور رہ رہ کر ہنستے رہے پھر کہا بالکل جھوٹ۔ آپ صرف چُھدّا اُتارنے آئے ہیں۔ میں نے کہا یہ بھی غلط نہیں لیکن آپ کو دیکھ کر لطف آگیا۔ بولے وہ کیسے؟ میں نے کہا بالکل ایسا معلوم ہوا جیسے گنیش جی کا جمعیۃ العلمار ایڈیشن ہو۔ قہقہہ لگا کر کرسی پر اُچھل پڑے۔ میں نے کہا قہقہہ نہ لگائیے۔ جنوبی ہندوستان میں آپ نے کبھی گنپتی کا میلا دیکھا ہے، وہاں گنیش جی کو سَر پر بٹھاتے ہیں لیکن پھر دریا بُرد کر دیتے ہیں۔ بولے کیا ہرج، یہ تو بڑی اچھی بات ہے، نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کبھی کھیر ہوتا۔

آج وہ لطیفہ بے اختیار یاد آگیا اور دل بھر آیا۔ وفات کی خبر سُن کر دہلی ان کی کوٹھی پر پہنچا تو چھوٹے بڑے امیر غریب مرد عورت کا کیسا غمگین مجمع اور کیسی یاس بھری فضا آنکھوں کے سامنے آئی۔ بڑے آدمیوں کی وفات پر جو ہجوم اکٹھا ہوتا ہے اور جس طرح میت اپنے ٹھکانے پہنچائی جاتی ہے وہ کس نے نہ دیکھا ہوگا۔ بہت قریب کے عزیز اور دوست تو واقعی مغموم اور مضطرب ہوتے ہیں۔ کچھ تجہیز و تکفین کے سلسلہ میں بھاگ دوڑ کرتے نظر آتے ہیں لیکن بہت بڑی تعداد خانہ پُری کے لئے ہوتی ہے اور جا بجا لوگ روز مرّہ کے مسائل اور پروگرام پر اس بے تکلفی سے گفتگو کرتے، ہنستے بولتے اور ردّ و قدح کرتے نظر آتے ہیں۔ جیسے وہ کسی کے دُکھ میں شریک ہونے کے لئے نہیں

بلکہ کسی ایٹ ہوم میں تفریح کی غرض سے جمع ہوئے ہیں!

لیکن شفیق صاحب کی وفات پر جو بات واضح طور پر نظر آئی وہ یہ کہ حاضرین میں دولت، اقتدار، شائستگی کے اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کے جتنے لوگ تھے سب کے سب یکساں طور پر مغموم تھے۔ ایک بھی ایسا نہ تھا جس کو دیکھ کر گمان ہو سکتا کہ وہ محض خانہ پُری کے لئے آ گیا تھا۔ ہر شخص مرحوم کی کسی نہ کسی بات کو یاد کر کے بے قرار ہو جاتا تھا اور اس طرح بے اختیار ہو کر بے قرار ہوتا تھا کہ اُسے اس کا احساس باقی نہ رہ گیا تھا کہ وہ کیا تھا اور کیا کر رہا تھا۔ کیسی کیسی خواتین کتنی بڑی تعداد میں کس کس مذہب اور فرقہ کی مائیں بہو بیٹیاں، ہر رسم و قید سے بے نیاز ہو کر اور ہر اجنبی غیر اجنبی محرم و نامحرم سے بے خبر شفیق صاحب کی یاد میں آنسو بہا رہی تھیں! مرحوم کیسی محبت اور عزت ان لوگوں کے دلوں میں چھوڑ گئے تھے اس کا اندازہ کرتا ہوں تو زمانہ اور زندگی کی ساری ناسازگاریوں کی طرف سے منہ موڑ کر فرد کی عظمت اور انسانیت کے شرف پر بے اختیار ایمان لانا پڑتا ہے۔

شفیق صاحب کسی نہ کسی ضروری ہی کام سے علی گڑھ آتے جس میں چندہ جمع کرانا لازمی طور پر شامل ہوتا۔ اس کا چندہ، اس کی ممبری۔ بڑے ہی گھردرے قسم کا کھدّر پہنے ہوتے۔ اسی طرح کا رومال یا چادر کندھے پر کھدّر ہی کی صدری۔ ان کا کھدّر دیکھ کر کچھ ایسا خیال آتا جیسے دنیا میں کپڑے کا اطلاق پہلے پہل اسی کھدّر پر ہو، جو شفیق صاحب کے حصّہ میں آیا تھا۔ اور خود ان کو اور ان کی سج دھج دیکھ کر یہ محسوس ہوتا کہ دنیا کسی کا کچھ بگاڑ سکتی ہو یا نہیں، شفیق صاحب کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ بگڑ جانے کی چیز شفیق صاحب نے اپنے ہاں رکھی ہی نہ تھی۔ ان کو دیکھ کر پُرانے زمانے کے دور افتادہ خود کفالتی

گاؤں کی یاد آجاتی ہے۔ جہاں زندگی کسی ضرورت کے لئے گاؤں سے باہر کی امداد کی محتاجی نہیں ہوتی تھی، جو ضرورت پیش آئی اپنے طور پر اپنے ہی گاؤں میں پوری کرلی۔ شفیق صاحب بھی کچھ اسی طرح کے تھے۔ وہ اپنے لئے کسی دوسرے کی خدمت کے محتاج نہ تھے، اپنی خدمت خود کر لیتے اور اپنے سے خوش ہو لیتے تھے، اُنھوں نے اپنے نفس کا اعتماد کچھ اس طور پر حاصل کر لیا تھا کہ وہ اس کی آسودگی کے لئے کچھ کریں یا نہ کریں، وہ اُن سے راضی اور خوش رہتا۔ آخر آخر میں تو کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے شفیق صاحب کے نفس نے شفیق کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہو! وہ ہمیشہ مُسکرا کر ملتے، ہنستے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے ان کے دل میں نہ مایوسی کے لئے کوئی جگہ تھی نہ سازش کے لئے۔ وہ اپنی مسکراہٹ اور ہنسی سے اپنی مکمل جیت اور آپ سے مکمّل تعاون کا اظہار و اعلان کرتے معلوم ہوتے، ان کے ہنسنے پر آپ مکمّل بھروسہ کر سکتے تھے۔

شفیق صاحب نے بڑی سخت بیماری اُٹھائی۔ کتنی دوڑ دھوپ کی گئی، کیسی کیسی دعائیں مانگی گئیں، کیا کچھ زیر باری نہ ہوئی۔ لیکن ہوا وہی جسے نہ ہونے دینے کے یہ سارے جتن کئے گئے تھے۔ انسان کی سیرت و شخصیت کا بھید جتنا مصیبت اور بیماری میں کھلتا ہے کہیں اور نہیں کُھلتا۔ مصیبت کی بھٹی میں کسی طرح کا ملمع قائم نہیں رہ جاتا۔ جب سارے دوسرے سہارے ٹوٹ چکے ہوں اس وقت بھی اپنا سہارا پکڑے رہنا بڑا کٹھن کام ہے۔ شفیق صاحب نے اپنا سہارا مرتے دم تک نہ چھوڑا۔ ان کے اچھے اور بڑے ہونے کی یہ دلیل سب پر بھاری ہے۔

بعض عزیزوں دوستوں کو اس پر اطمینان نہ تھا کہ ان کا علاج اور دیکھ بھال ٹھیک ہو رہی تھی لیکن شفیق صاحب کو اپنے سے زیادہ دوسروں

کا خیال رہتا تھا، وہ اس کو گوارا ہی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کا بھید ہو اور کسی کے رسوا ہونے کا امکان ہو۔ ڈاکٹر اور نرسوں سے اپنی ضرورت اور تکالیف بتانے کے بجائے برابر اُن کی خدمات کا شکریہ ادا کرتے رہتے۔ کوئی ملنے آتا تو اس کا خیر مقدم اس طرح کرتے جیسے وہ بالکل تندرست تھے۔ اپنی مسرت و محبّت کے اظہار سے وہ ہمیشہ تیمار دار کی ڈھارس بندھاتے۔ یہ کام آسان نہیں۔ تندرستی اور فراغت میں جو لوگ بڑے ہنس مکھ، یار باش اور دلیر پائے گئے۔ اکثر بیماری اور تنگدستی میں ان کو چڑچڑا، بودا اور دوستوں تیمارداروں کے لئے تکلیف دہ پایا گیا ہے۔ شفیق صاحب نے محبّت کی تازگی و توانائی مصیبت جھیلنے اور دوسروں کی خدمت کرتے رہنے میں ڈھونڈی اور پائی تھی اس لئے مصیبت میں ان کی خوبیاں اور زیادہ جگمگانے لگتیں۔ بعض پھول ایسے ہوتے ہیں جو سایہ سے زیادہ دھوپ میں اپنی پوری بہار دکھاتے ہیں۔

شفیق صاحب اودھ کے بڑے سر برآوردہ شریف وضع اور کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بچپن کا حال مجھے زیادہ معلوم نہیں، لیکن آج سے ۴۰۔۵۰ سال پہلے اس طرح کے خاندان کے بچّے جس ناز و نعمت کے پلے ہوتے تھے، اس کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے، پھر وہ علی گڑھ کے طالب علم ہوئے۔ اس عہد میں امیری اور امارت کے اظہار کا ایک طریقہ یہ بھی تھا، کالج میں ان کا شمار اونچے طبقہ والوں میں ہوتا تھا لیکن نان کوآپریشن کی تحریک علی گڑھ پہنچی تو فراغت اور بے فکری کی زندگی سے اس طرح ہاتھ جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے جیسے اسی کے منتظر بیٹھے تھے۔

اس وقت سے آخر وقت تک مرحوم نے ہندوستان کی جنگِ آزادی

میں قید و بند کے جیسے جیسے مصائب اُٹھائے، جامعہ ملیہ کے دورِ ابتلاؤ آزمائش کو جس بے جگری اور تازہ روئی سے جھیلا، کا سب اور کس مپرس کو لکھائی پڑھائی کی نعمت سے بہرہ مند کرنے کے بے رنگ و بے نام و نمود کام کو اُنھوں نے جس خاموشی اور خلوص سے پروان چڑھایا اور چھوٹے بچوں اور بڑے مقاصد کی پرداخت میں جس طرح وہ لگے رہے اور مر مٹے وہ مرحوم کو اُن خادمانِ خلق کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے جن کے کارناموں کی شہرت ان معنوں میں تو نہیں ہوئی جن معنوں میں ہم آپ شہرت کو شہرت سمجھتے ہیں لیکن بفرضِ محال کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ ہم بڑے لوگوں کو کہیں اُس ترتیب میں دیکھ پائیں جس میں ہم نے نہیں بلکہ خدا نے ان کو خاصانِ بارگاہ کی حیثیت سے اپنے ہاں جگہ دے رکھی ہے تو مجھے یقین ہے شفیق صاحب کا درجہ اُن بہت سے لوگوں سے اونچا ہوگا جن کو ہم نے اونچا قرار دے رکھا ہے! اور یہ کچھ شفیق صاحب ہی پر موقوف نہیں ہے۔ بے شمار ایسے حقیر اور گمنام لوگ گزرے ہیں اور گزرتے رہیں گے جن کو لوگوں نے نہیں پہچانا، لیکن وہ اپنے کردار کے اعتبار سے اتنے بڑے تھے کہ ہماری جان پہچان کے بہت سے لوگوں کا درجہ ان سے نیچا ملے گا۔

قطع نظر اس سے کہ خدمت کرنے اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کا شفیق صاحب میں کتنا حوصلہ تھا اور اس حوصلے کو اُنھوں نے کہاں کہاں اور کس طرح پورا کر دکھایا ان کی خدمت میں بڑی دل لگی بھی تھی۔ ان کو شاید ہی کسی نے دل گرفتہ پایا ہو۔ کبھی کبھی تو میں نے یہاں تک محسوس کیا ہے کہ وہ اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے اپنے آپ کو خوش رکھتے تھے۔ وہ یہ گوارا ہی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے لئے کوئی اور متفکر یا اضطراب ہو۔ شفیق صاحب کبھی ہار نہیں مانتے

تھے۔ کہتے تھے کہ نیّت بخیر ہو تو جیت ہمیشہ اپنی ہوگی، اس کا تعلق نہ نصیب سے ہے نہ فتح و شکست سے، وہ ہمیشہ دوستوں کی ہر تفریح میں اس طرح دلچسپی لیتے تھے جیسے وہ تفریح دوست کے لئے نہیں بلکہ خود ان کے لئے تھی۔ دوستوں کا بیان ہے کہ ان کی ہر تفریح نامکمل رہ جاتی تھی، اگر اس میں شفیق صاحب کی شرکت نہ ہو۔ سیر، شکار، کھیل کود، سفر حضر، ہنسی مذاق، رزم و بزم سب میں شفیق صاحب اس طرح حصّہ لیتے تھے، جیسے اسی کے لئے بنے تھے۔ یہ بتانا ذرا مشکل ہے کہ طبیعت کا یہ رنگ ان کے خلوص و خدمات کا نتیجہ تھا یا ان کے خلوص و خدمات نے طبیعت کا یہ انداز اختیار کرلیا تھا۔

شفیق صاحب کو چھوٹے بچّوں سے بڑی اُلفت تھی۔ جامعہ سے اُن کو جو لگاؤ تمام عمر رہا اور بچّوں اور بالغوں کی تہذیب کے کاموں میں ان کو جو سرشاری عمر بھر رہی یہ اسی اُلفت کا فیضان تھا۔ اچھے اور بڑے آدمی کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ ان کو بچّوں سے شغف ہو۔ ان کو اِن معصوموں کی بعثت میں اپنی خدمات کے مفید اور بامقصد ہونے کی بشارت ملتی رہتی ہے، مستقبل کی پرورش و پرداخت ماضی کی گود میں نہ ہو تو حال بقول ایک بزرگ کے جو رعایتِ لفظی کے پیش امام ہیں، بدحال ہوجائے! جس طرح ہم دنیادار اپنے بچّوں کے لئے کچھ نہ کچھ مال ملکیت چھوڑ جانے کے لئے تمام عمر ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں، اچھے اور بڑے لوگ بچّوں کو شائستگی اور صحت مندی سے آراستہ و استوار کرکے پوری نسلِ انسانی کے لئے خیر و برکت کا ورثہ چھوڑ جانے کی دُھن میں رہتے ہیں۔

شفیق صاحب بڑی محنت کرتے تھے۔ اس سے زیادہ محبّت کرتے تھے۔ یہی اور اتنا ہی نہیں۔ وہ بڑے جری بھی تھے۔ ۱۹۴۷ء میں دہلی پر قیامت

نازل ہوئی تو وہ قرول باغ میں تھے۔ مظلوموں کو، بے کسوں کو بچانے کے لئے وہ دن رات بھاگے بھاگے پھرتے تھے۔ ان کو دوسروں کے جان ومال، آبرو کی ویسی ہی فکر تھی جیسی ہمارے آپ جیسے دنیا داروں کو اپنے جان ومال اور آبرو کی ہوتی ہے، گولیاں چلتی رہیں، گولے پھٹتے رہے، چھرے چلتے رہے، آگ لگتی رہی، ناموس لٹتی رہی لیکن شفیق صاحب دیوانہ وار خدمت کرتے رہے۔ انھوں نے کسی سے مدد نہیں مانگی۔ کسی سے فریاد نہ کی۔ خود مدد پہنچاتے اور فریاد کو پہنچتے رہے۔ وہ اپنے کردار کی رو سے جیسے مسلمان تھے ویسے ہی حلیہ اور وضع قطع کے اعتبار سے بھی، دور سے مسلمان پہچان لئے جاتے تھے۔ ان کو جو کوئی جہاں چاہتا ٹھکانے لگا دیتا اور مجھے پورا یقین ہے، شفیق صاحب اپنا بچاؤ نہ کرتے اور قاتل کے سامنے بھی مسکراتے ہوتے لیکن ہوا یہ کہ بڑے سے بڑا شقی بھی ان کو گزند پہنچانے کی ہمت نہ کر سکا۔

بہت دنوں بعد ملاقات ہونے پر میں نے پوچھا شفیق صاحب آپ کو سبھوں نے چھوڑ کیسے دیا؟ آپ کا حلیہ اور جحم تو ایسا تھا کہ مارنے والے کو ایک کے بجائے دس کا ثواب ملتا، تو حسب معمول زور سے ہنسے اور بولے لوگ ثواب اتنا کما چکے تھے کہ اس کا بازار بھاؤ بالکل گر گیا تھا!

شفیق صاحب کی طبیعت میں شوخی بھی تھی اور شرارت بھی جس سے وہ دوستوں اور ساتھیوں اور خود اپنے آپ کو ہشاش بشاش رکھتے تھے۔ مہم کیسی ہی ہو شفیق صاحب ساتھ ہوں تو کوئی شخص تھکا ہارا محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ لوگوں کو خوب پہچانتے تھے اور بہت جلد پہچان لیتے تھے اور جو جس قماش کا ہوتا اس سے نبٹتے بھی اسی طرح تھے، جو بات کرنا چاہتے تھے اسے کسی نہ کسی طرح کرا ہی لیتے تھے۔ ان پر کبھی کبھی جلال بھی طاری ہو جاتا

لیکن ہوتا صرف چند لمحوں کے لئے۔ وہ بہت جلد پھر اپنے جیسے شائستہ اور شگفتہ ہو جاتے۔

ایک بار میرے سپرد ایک کام کیا تھا۔ اپنی کوششوں کا نتیجہ اُن کو سنانا تھا۔ میں نے کہا شفیق صاحب اور تو سب ٹھیک ہے البتہ فلاں صاحب قابو میں نہیں آتے۔ بولے ٹھیک ہے اس سے کام لینے کا اور طریقہ ہے۔ میں ٹھیک کر لوں گا، آپ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیئے۔ دوسرے ہی دن معلوم ہوا کہ وہ صاحب راہ راست پر آگئے۔ مجھے جتنی خوشی ہوئی اتنی ہی حیرت بھی۔ شفیق صاحب سے اس کرامت کی تفصیل پوچھی، بولے میرا پرانا دوست اور ساتھی ہے لیکن اس میں ایک مرض ہے۔ اس پر بڑا آدمی ہونے کا کبھی کبھی دورہ پڑتا ہے، پھر وہ نہ اپنے باپ کی سُنے گا نہ اپنی بیوی کی! اُس وقت اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ جب افاقہ ہو تو پھر کوشش کرنا چاہیئے۔ میں نے کہا شفیق صاحب یہ باپ اور بیوی ہی کیوں کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے؟ بولے اس میں نکتہ یہ ہے کہ پرانی چال کا آدمی ہو تو اس کے دل میں سب سے زیادہ احترام باپ کا ہوتا ہے اور نئی چال کا ہو تو سب سے زیادہ بیوی سے کور دبتی ہے۔

دوسرے یہ کہ باپ ہمیشہ شفقت اور شرافت کی بنا پر مشورہ دیتا ہے، بیوی نفع اور نقدی کے پہلو مدِ نظر رکھتی ہے۔ اگر کوئی شخص ان دونوں کو خاطر میں نہ لائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس پر بڑا آدمی ہونے کا بھوت سوار ہے اور ان طریقوں کے کام میں لائے بغیر راہ راست پر نہ آئے گا جو بھوت اُتارنے کے لئے ہمارے دیس میں مجرب مانے گئے ہیں ضمناً یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اگر ادنیٰ طبقہ کا کوئی آدمی ہو اور ادنیٰ حرکتیں کرنے لگے تو تحمل اور تواضع سے

کام لیجئے رام ہو جائے گا اور اونچے طبقے کا آدمی گھٹیا پن پر اُتر آئے تو اُسے یقین دلا دیجئے کہ گالی اور گھونسے سے بھی کام لیا جا سکتا ہے، فوراً ہوش میں آجائے گا!

شفیق صاحب کے جنازے پر جیسے دہلی کی ساری خلقت ٹوٹ پڑی تھی۔ جنازہ مٹکاف روڈ سے روانہ ہو کر جامع مسجد ہوتا ہوا، جہاں نمازِ جنازہ ادا کی گئی، سہ پہر میں جامعہ نگر پہنچا اور مرحوم کو جامعہ کے گورستان میں جہاں ڈاکٹر انصاری اور برگیڈیر عثمان آسودۂ خاک ہیں دفن کیا گیا۔

اِس دوران میں عزت اور محبت کے وہ سارے مظاہرے دیکھے جو دہلی کی حکومت اور دہلی کے چھوٹے بڑے باشندوں کی طرف سے کسی بڑے سے بڑے آدمی کی وفات پر بڑے سے بڑے پیمانے پر کئے جا سکتے تھے۔ پھر شفیق صاحب کی زندگی کے وہ ۲۵، ۳۰ سال یاد آنے لگے جو اُنھوں نے اپنی دُھن میں گزارے تھے، علی گڑھ سے چل کر جامعہ پہلے قرول باغ میں آباد ہوئی۔ اس کے بعد اوکھلا (جامعہ نگر) کو منتقل ہوئی۔ اس درمیان میں جامعہ اور جامعہ والوں پر کیا گزری اس کا کچھ اندازہ اس یادگار خطبہ سے ہو سکتا ہے جو ذاکر صاحب نے ۱۹۴۶ء میں جامعہ کی جوبلی کے موقع پر دیا تھا۔ اور کچھ اُس سماں سے بھی جو اس وقت ہمارے سامنے تھا۔ اس داستانِ رزم و ریاضت کو تصنیف کرنے کے لئے ہومر یا حالی کی ضرورت ہے۔

جنازہ کی نماز جامع مسجد میں پڑھی گئی اور میت جامعہ نگر (اوکھلا) پہنچائی گئی، میں ذرا دیر پہلے ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مزار سے کچھ فاصلہ پر جامعہ کی عمارت کے سایہ میں ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا اور جنازہ کے ساتھ جمِ غفیر کا لمحہ بہ لمحہ نہایت ترتیب اور خاموشی کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ قریب آنا دیکھنے لگا پھر وہ

زمانہ اور وہ مواقع یاد آئے جب دن کی مصروفیت و محنت سے فارغ ہو کر شفیق صاحب تنہا شہر سے جامعہ نگر واپس آتے تھے، تھکے ماندے گرد میں اَٹے اکثر بھوکے پیاسے! جامعہ کے حدود میں مُسکراتے ہوئے داخل ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ جامعہ کو ہر طرح سے اور ہر طرف سے اُگتے پنپتے دیکھ کر دل ہی دل میں باغ باغ ہو رہے ہوں۔ کوئی شناسا مِل جاتا تو خوش ہو جاتے، کچھ گلے دِل لگی اور محبت کے کہتے اور ایسا محسوس کرتے جیسے اپنے گھر آنگن اور اہل و عیال میں پہنچ گئے۔

آج اُسی جامعہ کی حدود میں شفیق صاحب کی میت لائی جا رہی تھی۔ کتنا بڑا تفاوت تصوّر کی نگاہ کے سامنے تھا! کل تک وہ کس طرح جامعہ میں آیا کرتے تھے، آج کس طرح لائے جا رہے تھے! اتنا زبردست مجمع، جامعہ کی سرزمین اور شفیق صاحب کہاں اور کس حال میں!

شفیق صاحب جو اس مجمع میں اور ایسے مواقع پر سب سے آگے ہوتے، ہر جگہ ہوتے۔ اور اپنی محبت، شگفتگی، حوصلہ مندی اور حوصلہ افزائی سے ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا ہوتے آج کہاں اور کس حال میں تھے۔ آج ان کی نعش کو دفنانے کے لئے لا رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں ان کو قبر میں اُتار کر تختہ اور مٹی سے بند کر کے چلے جائیں گے اور جس طرح آج شفیق صاحب دفن کر دیئے گئے ان کے لئے جو رنج والم تھا وہ بھی جلد یا دیر کسی اور قبر میں دفن کر دیا جائے گا! اور پھر کچھ ایسا ہو جائے گا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

زندگی کا یہی دستور چلا آ رہا ہے اور رہتی دنیا تک اس میں فرق نہ آئے گا۔ دُنیا کا کاروبار اور آپس کا نفع نقصان اتنا پیچیدہ اور پھیلا ہوا ہے اور پیٹ پالنے، جان بچانے، عزّت پانے، لذّت اُٹھانے، نام اُچھالنے اور روزمرّہ کے معمولات ادا کرنے کا جذبہ اتنا قوی اور عالمگیر ہے اور ان کی ہمہ وقت اتنی

دیکھ بھال رکھنی پڑتی ہے یا وہ ہمہ وقت ہماری اتنی دیکھ بھال رکھتے ہیں کہ ہم کسی حادثہ کو اپنے آپ پر زیادہ دیر تک مسلط نہیں رکھنا چاہتے اور رکھ بھی نہیں سکتے۔ دنیا کا سب سے عجیب پہلو یہی ہے کہ وہ موت کو زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ثابت نہیں ہونے دیتی بلکہ زندگی کو زندگی کا سب سے بڑا انعام بتاتی ہے۔ ایسا انعام جو ہر محرومی کی تلافی کرتا رہتا ہے۔ ایسا انعام جو بیحد بودا اور غیر تیقین ہونے کے باوجود بڑے سے بڑے عالم اور عامی کے دلوں کو مسخر کئے ہوئے ہے۔ زندگی کی ہماہمی اتنی مہلت نہیں دیتی کہ کوئی شخص موت کے عمل دخل پر زیادہ دیر تک غور کر سکے!

تو گویا شفیق صاحب کی زندگی اور موت کے کوئی معنی نہ تھے! تھوڑی دیر تک بیزاری اور بےبسی کا یہی عالم رہا۔ میرے قریب کچھ اور لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وضع قطع، حرکات سکنات اور بول چال سے معلوم ہوتا کہ یہ دہلی سے باہر کے تھے۔ نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ بات بات پہ زبان سے ناملائم کلمے نکالتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا۔ جیسے ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ جائے گی۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے غبار تھا۔ میں تعجب کر رہا تھا کہ آخر یہ کس لئے شہر میت کے ساتھ پیدل چل کر آئے تھے۔ تجہیز و تکفین ہو چکی۔ پولیس کے دستے نے لاسٹ پوسٹ سر کی۔ لوگ رخصت ہونے لگے تو یہ جماعت بھی اُٹھی۔ ایک نے اپنے ساتھی سے جو ذرا دُور تھا پکار کر کہا، سالے بھاگا کہاں جا رہا ہے۔ میں بھی تو چل رہا ہوں۔ ایک بڑی پھبنک! پھر ایک دھیمی دلدوز آواز میں جو شاید اپنے ہی کو سنانے کے لئے تھی بولا۔ چلو چھٹی ہوئی دلّی بھر میں ایک ہی شریف آدمی تھا، آج وہ بھی اُٹھ گیا۔

مولانا سیّد سلیمان ندویؒ

سید صاحب سے پہلے پہل اعظم گڑھ میں ملاقات ہوئی ہوئی تھی. مولانا سہیل کے توسل سے، بہت دن ہوئے، شاید ۳۰، ۳۲ برس! تعطیلوں میں تفریحاً مولانا اور دوسرے عزیز دوستوں سے ملنے اعظم گڑھ گیا تھا، سہیل صاحب کو علّامہ شبلی مرحوم سے بڑا شغف ہے، شبلی کے سامنے وہ سب کو بے حقیقت سمجھتے ہیں، حد یہ ہے کہ کبھی کبھی اپنے آپ کو بھی! "کبھی کبھی" یوں کہ اس بارۂ خاص میں مولانا کے بیانات میں اکثر تضاد رہا ہے!

فرمایا چلو تم کو حضرت مرحوم کے جانشین سے ملا لاؤں، میں نے کہا مولانا آپ کے ہوتے کون جانشین ہوگیا؟ یہ آپ کی عالی ظرفی ہے کہ آپ کسی اور کو مرحوم کا جانشین مانتے ہیں، آپ اپنے حاشیہ نشینوں کا ایمان کیوں پرکھتے ہیں جو آپ کو حضرت مرحوم کا صدق دل سے جانشین سمجھتے آئے ہیں، اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ آپ کے بعد نہ حضرت مرحوم کا کوئی جانشین رہے گا، اور نہ خود آپ کا!

مولانا اس پر مسکرائے اس طور پر کہ پان کی پیک جو دہن کے گوشہ سے

باہر سرک آئی تھی، اس کو ہاتھ سے اِس طرح پونچھا کہ اُس کی سُرخی کچھ داڑھی مونچھوں پر رہ گئی، کچھ ہتھیلی پر آئی، اور وہاں سے بچّہ کے کُرتے پر منتقل ہوئی جو پہلو میں بیٹھا ہوا تھا، لوگوں نے شور مچایا، تو بولے ارے یہ کہاں سے آگیا میں تو سمجھ رہا تھا کہ منشی جی مقدّمہ کے کاغذات رکھ گئے ہیں!

شام کو مولانا کے ہمراہ شبلی منزل گیا، سیّد صاحب سے ملاقات ہوئی سُہیل صاحب نے تعارف کرایا، شبلی منزل کے اور احباب و بزرگوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ سیّد صاحب بڑی شفقت سے ملے۔ ابھی لطف و مرحمت کی باتیں ختم نہیں کی تھیں کہ سہیل صاحب نے کوئی ادبی یا فقہی مسئلہ چھیڑ دیا، جسے معارف کے اوراق میں کبھی دیکھ چکے تھے، سیّد صاحب نے ہاں نہیں میں بات ٹال دی شبلی منزل میں کسی اور کی ہمّت نہ ہوئی کہ مولانا سے اُلجھے مولانا کو دلائل سے زیر کرنا ناممکن تھا۔ طالب علمی میں ہم سب کا طریقہ یہ تھا کہ بحث کے آخری منزل پر پہنچتے پہنچتے مولانا سے زبردستی کچھ قرض لے کر چل دیئے اور مولانا کسی اور سے بھڑنے کسی اور طرف چلے گئے۔

اس دن کے بعد سے آخر زمانہ تک جب وہ پاکستان تشریف لے گئے اور پھر جوارِ رحمت میں پہنچ گئے سیّد صاحب سے ملنے اور اُن کی محبت و مروت سے بہرہ مند ہونے کے بے شمار مواقع ملے، علی گڑھ آنا ہوتا تو ہمیشہ میرے ہاں قیام کرتے۔ میرا میرے بچّوں کا، میرے عزیزوں و دستوں کا بڑا خیال کرتے تھے، اتنا خیال کہ کبھی کبھی میں اپنے سے شرمندہ ہونے لگتا۔ یونیورسٹی کورٹ کا معرکہ کا کوئی جلسہ ہونے والا ہوتا تو عمائد قوم کا اچھا خاصا اجتماع ہو جاتا، ایسے مواقع پر یونیورسٹی کے طلبہ یونین میں کوئی مباحثہ یا مشاعرہ منعقد کرتے، یا علی گڑھ میں اکابر شعراء مجتمع ہو جاتے، وہ ایک دن بڑی رونق کے گزرتے، میرے ہاں

مختلف الخیال حضرات یکجا ہو جاتے مثلاً سید صاحب، اصغر صاحب (گونڈوی) ذاکر صاحب، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، سید الطاف حسین (ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ) ان میں کچھ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کی حمایت میں تشریف لائے تھے، کچھ ذاکر صاحب کا ساتھ دینے کے لئے۔

گھر پر وہ مسائل نہیں چھیڑے جاتے تھے جو کورٹ میں پیش ہونے والے ہوتے، اس لئے کہ شریک ہونے والوں میں کوئی ایسا نہ تھا جو پہلے سے رائے قائم نہ کر چکا ہوتا تھا۔ اس وقت کورٹ کا یہی رنگ تھا، البتہ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کا کوئی عزیز قریب یا حکومت کا کوئی بڑا عہدہ دار زیادہ سرگرمی دکھانے کے لئے مرحوم کی حمایت میں بحث کرنے آجاتا، یہ موقع بڑا ہی پر لطف ہوتا تھا، ذاکر صاحب بھی موجود ہوتے تھے، اور ڈاکٹر صاحب کے حمایتیوں کے دلائل اس سنجیدگی اور ہمدردی سے سنتے اور کہیں کہیں ہمت افزائی کے طور پر ایسا لقمہ دے جاتے کہ بولنے والا بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے لگتا، ڈاکٹر صاحب مرحوم کے سمجھ دار ساتھی بڑی دقت میں مبتلا ہو جاتے، اور چاہتے کہ یہ بحث کسی نہ کسی طرح ختم ہو جائے۔

سید صاحب کا مسلم یونیورسٹی سے بڑا پرانا اور گہرا تعلق رہا، جہاں تک میرا خیال ہے مرحوم ۲۳، ۲۴ء سے علی گڑھ آنے جانے لگے تھے، کورٹ کے مسلسل ممبر رہنے کے علاوہ مرحوم ان کمیٹیوں اور شعبوں کے ممبر منتخب یا مقرر ہوتے رہے جو علوم مشرقیہ یا مذہبی اور ادبی مسائل سے متعلق ہوتے، یہ سلسلہ تقسیم ملک تک قائم رہا، تقسیم سے پہلے یونیورسٹی پر طرح طرح کے دور آئے۔ سید صاحب کسی نہ کسی حیثیت سے برابر ارباب یونیورسٹی کے شریک کار رہے اور اکثر اہم مواقع پر سید صاحب کی اصابت رائے سے یونیورسٹی کو

بڑا فائدہ پہنچا۔

سید صاحب اور مولانا سلیمان اشرف صاحب ہم وطن تھے۔ دونوں کے سیاسی معتقدات جداگانہ تھے، بعض مذہبی امور میں ذہنی یگانگت نہ تھی، مولانا سلیمان اشرف صاحب بڑے طنطنے کے آدمی تھے، جس کے بارے میں جو خیال رکھتے، اس کا اظہار برملا کرتے تھے، اور کوئی جھگڑا آن پڑے تو مفاہمت کرنے پر مشکل ہی سے آمادہ کئے جا سکتے تھے، علامہ شبلی مرحوم کے کچھ زیادہ قائل نہ تھے، دارالمصنفین کے بھی کچھ ایسے معترف نہ تھے، جس کسی کو اپنی طبیعت کا نہیں پاتے تھے، نہ اُس کے قریب جاتے تھے، نہ اُسے قریب آنے دیتے تھے۔

لیکن سید صاحب جب کبھی علی گڑھ آتے تو مولانا سلیمان اشرف صاحب کے ہاں ضرور جاتے، دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوتے اور نہایت خلوص اور بے تکلفی سے گفتگو کرتے، اور میں جانتا ہوں کہ اس میں اس کا مطلق کوئی دخل نہ تھا کہ سید صاحب سلیمان اشرف کے ہم وطن یا دارالمصنفین کے کرتا دھرتا تھے، یا ملک میں ان کی بڑی مان دان تھی، ان دونوں بزرگوں کے باہمی خوشگوار تعلقات کا موجب ایک طور پر مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب فاروقی جونپوری ناظم دینیات تھے، جن کے سید سلیمان صاحب سے بڑے پرانے اور مخلصانہ تعلقات تھے، اور خود مولانا سلیمان اشرف صاحب مولانا ابوبکر صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔

سید صاحب کا مزاج مولانا سلیمان اشرف کے مزاج سے بالکل مختلف تھا، سید صاحب کو کوئی مشتعل نہیں کر سکتا تھا، وہ کسی حال میں برہم یا بے اختیار نہیں ہوتے تھے، سید صاحب خود علامہ شبلی سے طبعاً مختلف تھے۔ میں نے علامہ شبلی مرحوم کو نہیں دیکھا، لیکن ان کی تصانیف پڑھی ہیں، جن لوگوں نے ان کو قریب سے

دیکھا تھا، ان سے ملا ہوں، خود شبلی پر جو کچھ لکھا گیا، اس سے بھی تھوڑا بہت آشنا ہوں، علامہ شبلی جتنے ذہین اور جذباتی تھے، (ذہین اکثر جذباتی ہوتے ہیں) شعر کہنے اور پرکھنے کا جیسا ملکہ ان میں تھا اُن کی شاعری، اُن کی نثر، اُن کے خطوط سب میں حُسن طبیعت اور "سوزِ دروں" کی جیسی دل آویز مثالیں ملتی ہیں اور دنیوی معاملات میں جس سوجھ بوجھ سے وہ کام لیتے تھے یا لے سکتے تھے، سیّد صاحب ان سب سے عاری تھے۔

سیّد صاحب کی جس بات کا میں گرویدہ تھا، وہ ان کا علمی تبحّر ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ علمی دیانت بھی تھی، وہ کبھی علم کو کسی ادنیٰ مقصد کے حصول کے لئے کام میں نہیں لاتے تھے، علم نہایت ہی خطرناک چیز ہے، کم ذی علم ایسے پائے گئے ہیں، جنہوں نے علم سے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے ساتھ ہی نقصان نہ پہنچایا ہو، ایک مثال مذہب سے دی جاسکتی ہے۔ بطور کلیّہ تو کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن اپنے ہوش کی زندگی میں اب تک یہی دیکھتا آیا ہوں کہ جہاں کہیں لوگوں کو اپنے ادنیٰ مقاصد میں کامیابی نظر نہ آئی، اُنھوں نے مذہب کو آڑ بنالیا، پھر جو آفتیں نازل ہوتی ہیں، وہ سب جانتے ہیں۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ علم، مذہب اور آزادی باوجود بہترین نعمت ہونے کے نااہل سوسائٹی میں بڑے خطرناک عناصر ہیں۔

بات کہاں پہنچی کہنا یہ شروع کیا تھا کہ سیّد صاحب کا علم کیا تھا، اور کیسا تھا، وہ علم ہی سے واقف نہ تھے، علم کی برگزیدگی کا بھی احساس رکھتے تھے، اور اس کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتے، اکثر ایسے عالم دیکھے گئے ہیں، جو صرف علم کا بیوپار کرنا جانتے ہیں، علم کا مفہوم میرے نزدیک جاننا پہچاننا ہی نہیں، جاننے پہچاننے کی ذمہ داری بھی ہے۔ جب تک کوئی معلم علم کی برگزیدگی کو ماننے اور

منوانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو۔ اس کو علم کا کاروبار نہ کرنا چاہیئے۔ آجکل دنیا میں جو ہلچل، افراتفری یا بےدلی اور بیزاری پھیلی ہوئی ہے اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ علوم اور ان علوم کے پھیلانے کے وسائل تو بہت بڑھ گئے ہیں لیکن اچھے معلّم تقریباً ناپید ہیں جس کی وجہ سے علم اور زیادہ خطرناک بن گیا ہے' دنیا میں ہر مرض کی تیر بہدف دوائیں کیوں نہ ایجاد کر دی جائیں، اگر اچھے اطبا میسّر نہ ہوں تو یہ دوائیں خطرہ کا موجب بن سکتی ہیں۔ یہی حال علوم کا ہے!

سیّد صاحب جن علوم سے بہرہ مند تھے اُن پر اُن کی نظر پیشہ وارانہ نہ تھی مجرمانہ تھی، وہ محض فنی اصول پر کسی مسئلہ کو ناپ تول کر ختم نہیں کر دیتے تھے بلکہ اس کی کوشش کرتے تھے کہ اس مسئلہ کے رد یا قبول میں دماغ اور دل دونوں متفق ہو جائیں، سیّد صاحب نے اسلامی عقائد اور اسلامی مسائل پر (خواہ وہ معاش سے متعلق ہوں یا معاد سے) طرح طرح سے بحث کی ہے لیکن مجھے کوئی ایسا موقع نہ ملا جہاں یہ محسوس ہوا ہو کہ مصنّف نے اپنی بات دھوکے، دھمکی سے یا خطابت اور شاعری کے زور سے منطق اور فلسفہ کا چکر دے کر یا چلی کٹی سنا کر یا رو پیٹ کر منوانے کی کوشش کی ہو جیسا کہ بعض نام کے مولوی اور اشتراکی کیا کرتے ہیں! سیّد صاحب نے بات ہمیشہ متانت اور دیانت سے کہی نپی تُلی کہی، اور اس طرح کہی کہ اُن کو ایک بیش بہا بات معلوم ہوئی تھی، جس پر اُنھوں نے بڑی محنت قابلیت اور وقت صرف کیا تھا۔ اور چاہتے تھے کہ اسے ان لوگوں تک پہنچائیں جو اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے، علم کا معلّم سے یہی تقاضا ہے!

سیّد صاحب کی تصانیف میں سے جس تصنیف نے مجھے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کے خُطباتِ مدارس ہیں۔ شاید سب سے پہلے میں نے ہی سیّد صاحب کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ اِن خطبات

کا اچھی انگریزی میں ترجمہ ہو جائے، تو بہت مفید ہو گا۔ سید صاحب نے اس تجویز کو پسند کیا تھا، بعض عزیزوں نے اس پر کچھ کام کرنا شروع بھی کر دیا تھا، لیکن پھر کیا ہوا، اس کا علم نہیں، اسلامی عقائد اور شعائر سے متعلق اتنی اچھی اور مختصر کتاب شاید اسلامی ممالک میں بھی نہیں لکھی گئی، یہی نہیں بلکہ اکثر یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ اسلام اور اسلامیات سے متعلق جتنی مفید اور معیاری تصانیف ہندوستان کے مسلمان اربابِ فکر و نظر نے پیش کی ہیں، اسلامی ممالک میں اس پایہ کی کتابیں شاید نہیں تصنیف ہوئیں۔ دور جانے کی ضرورت نہیں صرف دارالمصنفین اعظم گڑھ کی گذشتہ سال کی مطبوعات کا جائزہ لیا جائے تو اس بات کا آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے! یہ گمان اور قوی ہو جاتا ہے، جب اس امر کو بھی مدِ نظر رکھیں کہ دارالمصنفین جیسے چھوٹے بڑے ادارے ہندوستان میں اور بھی ہیں۔

دس بارہ سال ہوئے یا شاید اس سے بھی زیادہ ایک بار سید صاحب سے اس مسئلہ پر گفتگو آئی کہ مذہبی، اخلاقی اور ذہنی اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کا ہندوستان سے باہر کے مسلمانوں سے موازنہ کیا جائے تو کیا نتیجہ نکلے گا، سید صاحب نے بتایا کہ تینوں اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کا پایہ باہر کے مسلمانوں سے بلند ہو گا۔ اثنائے گفتگو میں یہ بھی فرمایا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ باہر کے مسلمانوں کی عام حالت بحیثیت مجموعی ایسی نہیں ہے جس پر یہاں کے مسلمان بھروسہ یا ان کے رہن سہن اور طور طریقوں کی تقلید کریں۔

خیام کے بارے میں مغربی مبصرین نے جو کچھ لکھا تھا، اور ان کی دیکھا دیکھی یا سُنی سُنائی ہم ہندوستانی جو کچھ کہنے لگے تھے، وہ میرے پیش نظر تھا لیکن خیام پر سید صاحب کی تصنیف سامنے آئی تو دل باغ باغ ہو گیا کہ معرکہ کی ایک

تصنیف اُردو میں دیکھنے میں آئی جو کسی زبان کے بڑے سے بڑے تحقیقی کارناموں کے ساتھ رکھی جا سکتی ہے، اس کتاب کی تصنیف میں سید صاحب کے حیرت انگیز طالب علمانہ شغف، مورّخانہ ژرف نگاہی، ادبی پرکھ اور عالمانہ بصیرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، معمولی سے معمولی دعویٰ کو مستند سے مستند مآخذوں سے مستحکم کیا ہے، ماخذات کے لئے کس کس بے کنار سرد سنسان اور دشوار گذار جنگل اور گھاٹیوں سے گزرنا پڑا ہوگا، تب کہیں جا کر کسی رہرو کے نقشِ قدم ملے ہوں گے، اور جلوۂ منزل کے متعیّن کرنے کا امکان پیدا ہوا ہوگا، معلوم نہیں، اس تصنیف پر سید صاحب کو کسی ملک کی بڑی سے بڑی یونیورسٹی یا اکیڈمی بڑے فخر اور خوشی سے اعلیٰ علمی ڈگری دے سکتی ہے۔

سید صاحب کو اپنے اُستاد علامہ شبلی مرحوم سے بڑی عقیدت تھی، سیرتِ شبلی لکھ کر سید صاحب نے اس کا حق بھی ادا کر دیا ہے، اس کتاب میں جہاں کوئی کمی ملتی ہے، وہ سید صاحب کے فنّی شعور کی کوتاہی کے سبب سے اتنی نہیں ہے، جتنی اس شغف کی بنا پر ہے، جو ایک نہایت درجہ شریف اور سعید شاگرد کو اپنے شفیق اور محترم اُستاد سے ہو سکتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں مصنّف اپنے ہیرو میں کوئی خامی دیکھنا نہیں چاہتا، یہ بات ٹھیک ہو یا نہیں سمجھ میں آسانی سے آجاتی ہے۔

باوصف اس عقیدت کے سید صاحب کی شخصیت اور ان کا اسلوبِ تحریر بھی شبلی سے مختلف ہے، شبلی کے قلم میں بڑی رعنائی اور برنائی ہے، تخیل میں رنگینی اور جذبہ میں حرارت اور تلملاہٹ ملتی ہے، جذباتی اور تخیلی فن کاروں کے یہ خاص صفات ہیں، یہ صفات فنونِ لطیفہ کے لئے جتنے کارآمد ہو سکتے ہیں، تاریخ، تحقیق یا تنقید کے لئے نہیں! شبلی کی طرح سید صاحب کو بھی تاریخ سے

بڑا لگاؤ تھا، بہت زیادہ لگاؤ، کوئی مسئلہ ہو سید صاحب اس کے وجود کو ماضی میں تلاش کئے اور پرکھے بغیر نہیں رہتے تھے، سید صاحب کی کسی قسم کی تحریر ہو تاریخ کے حوالے اس میں ضرور ملیں گے اور شاید یہ اسی کا فیضان تھا کہ واقعہ کچھ ہو شخصیت کسی کی ہو سید صاحب کا قلم اکثر و بیشتر چلتا تھا اپنے ہی راستے پر، اور اپنی ہی رفتار سے! جس میں ثابت قدمی اور ہمواری ملتی ہے، سید صاحب تاریخی دیانت و امانت کا اس درجہ لحاظ کرتے تھے کہ ان کو اپنی تصانیف میں شاعری کرنے کی بہت کم فرصت یا مواقع ملتے تھے! وہ تحقیق اور تنقید میں جتنی احتیاط برتتے تھے، اور محنت کرتے تھے، اتنی ہی مطالعہ کرنے والے کے جذبات یا تخیل کو بے ضرورت مہمیز کرنے سے پرہیز کرتے تھے، تصانیف میں شبلی کا انداز مشرقی ہے۔ سید صاحب کا مغربی، دونوں کی ادبی شخصیت میں بھی یہ امتیاز نمایاں ہے، بحیثیت طالب علم میں شبلی سے متاثر ہوا اور بحیثیت معلم سید صاحب سے!

یہاں سید صاحب کی تصانیف اور مقالات پر تبصرہ مقصود نہیں ہے، یہ کام بڑا طویل اور مشکل ہے اور ایک آدمی کے بس کا ہے بھی نہیں، کہنا یہ ہے کہ علمی تدقیقات کے جدید طور طریقوں سے ناآشنا ہونے کے باوجود اس کے آداب سید صاحب اپنی تصانیف میں بڑی خوبی اور پابندی سے ملحوظ رکھتے تھے، کتنے مستند حوالے کہاں کہاں سے فراہم کرتے تھے، اور تقسیم ابواب اور ترتیب مضامین میں کس سلیقہ سے کام لیتے تھے کہ معمولی سے معمولی طالب علم بھی پوری تحقیقات سے پورے طور پر آشنا ہو جاتا تھا۔

سید صاحب کا حافظہ بڑا قوی اور ذہن بڑا مرتب تھا، ان کے ذہن میں تنقیحات بڑی واضح اور مکمل ہوتی تھیں، کام کی باتیں ضخیم کتاب اور پیچیدہ

سے پیچیدہ بحث سے بہت جلد اخذ کر لیتے تھے، اور اُن کو اُن کا صحیح مقام دینے میں خاص ملکہ رکھتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ اپنے ذخیرۂ معلومات کی فہرست اتنی ہی واضح اور مکمّل رکھتے ہوں جتنی کسی اچھی لائبریری کی فہرست کتب جو جدید ترین اصولوں پر مرتب کی گئی ہو، میں نے سید صاحب کو مطالعہ کرتے یا کتاب لکھتے نہیں دیکھا ہے۔ لیکن ان کی تصانیف پڑھنے اور ان سے بعض مسائل پر گفتگو کرنے سے جن باتوں کا اندازہ لگا سکا ہوں، وہ بیان کر دی ہیں، ممکن ہے استنباط نتائج میں غلطی سرزد ہوئی ہو!

حسب نسب، علم و فضل، اخلاق و عادات، خدمت ملک و ملّت کے اعتبار سے سید صاحب کا درجہ بہت اونچا اور پُورے طور پر مسلم ہے، جہاں تک میری معلومات ہیں، سید صاحب کی تعلیم و تربیت پُرانے طریقوں، پُرانے اُستادوں اور بزرگوں کے سایۂ شفقت اور پُرانی فضاؤں میں ہوئی تھی، جدید علوم و فنون سے براہِ راست اُنھوں نے کسی سے استفادہ نہیں کیا تھا، لیکن نئے افکار اور نئے طور طریقوں سے اُنھوں نے اپنے آپ کو اس خوبی اور خاموشی سے آشنا کر لیا تھا کہ وہ کہیں اجنبی نہیں معلوم ہوتے تھے، چاہے وہ اہلِ علم کا حلقہ ہو چاہے ارباب سیاست کی مجلس، خواہ طالبِ علموں کی جماعت ہو، خواہ عامۃ الناس کا اجتماع، جدید افکار، اور رجحانات سے کوئی کتنا ہی آشنا کیوں نہ ہوتا، سید صاحب سے مبادلۂ خیال کرنے میں اُسے کبھی یہ محسوس نہ ہوتا کہ وہ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہا ہے جس کی معلومات روایتی ہیں، یا جس کا ذہن بندھے ٹکے خانوں میں اسیر ہے یا جس کے فکر و نظر کا دائرہ تنگ ہے، علی گڑھ میں جدید ترین افکار و اطوار سے مسلح اور مرصّع نوجوانوں کو میں نے دیکھا کہ خالص علمی اور ذہنی سطح پر مولانا کی ہمسری نہ کر سکتے تھے اور ہمیشہ یہ ہوا کہ وہ سید صاحب

سے کچھ سیکھ کر ہی واپس گئے۔

نوجوانوں کے ذہنی رجحانات کے بارے میں ایک بار سید صاحب سے گفتگو ہوئی تھی، فرماتے تھے کہ عربی فارسی ماخذات پر عام نوجوان طالبعلموں کو عبور نہیں، ان ماخذات سے متفرق و نامکمل باتیں جو یوروپین تصانیف میں نظر آجاتی ہیں، وہ ان کو غلط راستہ پر لگا دیتی ہیں، یہ نوجوان ذہین اور افکار کے اعتبار سے مخلص ہوتے ہیں، یہ قیاس صحیح نہیں ہے کہ وہ طبعاً دین کی باتوں سے بیزار اور تاریخ و روایات سے بیگانہ ہوتے ہیں، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ان کو صحیح ماخذ، صحیح مفہوم اور صحیح سیاق و سباق بتانے والا کوئی نہیں! بات کچھ اور آگے بڑھی تو فرمانے لگے۔ اس صورتِ حال کی ذمہ دار ایک تاریخی حقیقت بھی ہے۔

بات یہ ہے کہ صلیبی محاربات نے مغرب میں مسلمانوں کے خلاف ہر طرح کی قوتوں کو اُبھارا، سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی اعتبار سے یورپ میں تاحال مسلمانوں کو جس جس طرح مطعون و مغلوب کیا گیا، وہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے، اس کے ساتھ ساتھ یورپ کے اہلِ فکر و نظر بالخصوص وہ جن کی ذہنی اُفتاد مذہبی تھی، اُنھوں نے اسلامی تصانیف سے جہاں تہاں سے ایسے اقتباسات لیے جو اُن کے تبلیغی تصنیفی پروگرام کے لئے مفید تھے، ہر ملک میں علوم کی ابتدائی تاریخ تقریباً یکساں رہی ہے یعنی مذہبی طبقہ تصنیف و تبلیغ کا اجارہ دار رہا ہے اور مصنفین کا یہ طبقہ اکثر دانستہ اور کبھی کبھی نادانستہ طور پر اپنی غرض کو زیادہ پیشِ نظر رکھتا ہے، حقیقت کو کم! پھر کچھ لطیفے سُناتے رہے کہ کس طرح کے اقتباسات سے لے کر کس طرح کے فتنے اُٹھائے جا سکتے ہیں یا اُٹھائے گئے ہیں، اور انگریزی سلطنت اور انگریزی زبان کے عروج کے ساتھ یہ

غلط بانیاں کہاں کہاں پہنچیں، اور کیا رنگ لائیں۔

ایک بار کسی کمیٹی یا شعبہ کی میٹنگ میں شرکت کرنے تشریف لائے تھے، یونیورسٹی اسٹاف کلب کے ممبروں نے سید صاحب سے درخواست کی کہ موصوف کلب میں تشریف لاکر کسی موضوع پر تقریر فرمائیں۔ اسٹاف کلب اس طرح کی فرمائش کسی سے بہت کم کرتا ہے، تقریر کا موضوع غالباً فنِ تاریخ پر مسلمانوں کا احسان یا اس سے ملتا جلتا کوئی اور موضوع تھا۔ سید صاحب نے سوا گھنٹہ سے اوپر تقریر فرمائی، وہ لوگ جن کو اس موضوع سے خاص ذوق تھا بیان کرتے تھے کہ سید صاحب کی نظر اس موضوع پر جتنی وسیع اور واضح ہے اور جتنے متنوع اور مستند ماخذ سید صاحب کے علم میں ہیں، اتنے شاید ہی کسی اور کے علم میں ہوں، جس طرح بچے آٹوگراف لینے مشاہیر پر گرتے ہیں، اسی طرح سید صاحب سے لوگوں نے ماخذات نوٹ کئے۔

سید صاحب تقریر کرنے میں چہرہ باندھنے یعنی تمہید اٹھانے یا کسی نہ کسی معذوری کے بیان کرنے میں مطلق وقت نہ صرف کرتے جیسا کہ عام طور سے پیشہ ور مقرروں کا دستور ہے، کچھ گلے اور سینے کی تکالیف، کچھ سفر کی صعوبت کچھ ملک و ملت کی ابتری یا اپنی نااہلی کا تذکرہ کیا، اس کے بعد تقریر شروع کی۔ سید صاحب کبھی اس طرح کی باتیں نہ کرتے، اپنی جگہ سے اٹھے۔ تقریر کرنے کی جگہ پر آکھڑے ہوئے، سلام علیکم کہا، مذہبی موضوع ہوا تو بسم اللہ پڑھی، کلام پاک کی کوئی آیت نہایت سادگی اور احترام سے تلاوت فرمائی اور تقریر شروع کر دی۔

آواز میں اتار چڑھاؤ نہ ہوتا، چہرے پر جذبات کی دھوپ چھاؤں نہ طاری ہونے دیتے، ہاتھ پاؤں نہ پٹکتے، نہ پھینکتے، کوئی بلند یا بلیغ فقرہ کہہ کر اس کے متوقع نہ رہتے کہ حاضرین سے شورِ تحسین اٹھے، جیسا کہ اکثر لوگ کرتے

ہیں، باتیں بڑی واضح کہتے، الفاظ و عبارت کی دھوم دھام ہوتی البتہ کبھی کبھی ایک آدھ فقرہ رعایتِ لفظی کے ساتھ کہہ جاتے لیکن یہ رعایتِ لفظی صرف تفریحی نہ ہوتی بلکہ اس کے پیچھے کوئی بھید ہوتا۔ سیّد صاحب جس بات کو چھپا کر اُجاگر کرنا چاہتے تھے، یا اُجاگر کو چھپا کر کہنا چاہتے تھے وہاں اس طرح کی مناسبات لفظی سے کام لیتے، سید صاحب کو رعایتِ لفظی سے تفریح ضرور ہوتی، بے تکلف اور مخلص لوگوں کی صحبت میں تھوڑی دیر تک ضلع جگت کا التزام رہتا، یہ مشغلہ رعایات اور مناسبات سے بھی بڑھنے لگتا، تو اور زیادہ محظوظ ہوتے!

سید صاحب تقریر کرنے میں کہیں اٹکتے نہ تھے، اچھے سے اچھے مقرر بھی کبھی کبھی جملہ میں مبتدا اور خبر کو مربوط نہیں کر پاتے تو ذرا دیر اٹکتے اُلجھتے ہیں، سیّد صاحب کی تقریروں میں شاید کبھی کوئی ایسا موقع آیا ہو، ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری تقریر قلم بند ہو جسے وہ اطمینان و اعتماد سے دُہراتے جا رہے ہوں، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ سیّد صاحب کی تقریر کب ختم ہو گی، کسی قدر لمبی تقریر کرتے تھے، تقریر کے کچھ ایسے ماہر بھی نہ تھے، لیکن تعجب یہ ہے کہ اُن کی تقریر سے دل اُکتاتا نہ تھا، ہر مجمع میں کچھ نہ کچھ ایسے بے فکرے ضرور ہوتے ہیں جو زیادہ دیر تک خاموش اور سنجیدہ نہیں بیٹھ سکتے۔ کوئی جادو بیان مقرر ہوا اور موضوع دلچسپ تو مجمع دیر تک خاموش رہ سکتا ہے، اور لطف اندوز بھی ہوتا ہے، لیکن سیّد صاحب یقیناً مقرروں کے اس زمرہ میں نہیں آتے تھے جن کو جادو بیان تو کیا غیر معمولی بھی کہا جا سکے، وہ تقریر کے فن و فسوں سے بے نیاز، لیکن ان کی باتوں میں اثر ہوتا تھا، اور ذہن کے کسی نہ کسی حصہ میں اُتر جاتی تھیں۔

ان تقریروں میں بڑا اخلوص، بڑا وزن اور بڑی سادگی ہوتی تھی، سننے والوں کو اس پر اعتماد ہوتا کہ سیّد صاحب کوئی ایسی بات نہ کہیں گے جس کے ثبوت میں

قوی سے قوی سند نہ پیش کر سکتے ہوں، سید صاحب سے اختلاف کرنا بڑا مشکل تھا، ذاتی معاملہ ہو، علمی یا اجتماعی ہو، وہ بڑی جچی تلی، اور شریفانہ رائے دیتے تھے، مجھے تقریر سُننے کا بالکل شوق نہیں، لیکن بعض لوگوں کی تقریر ضرور سُنتا ہوں اس لئے کہ اس کا یقین ہوتا ہے کہ یہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کہیں گے جس سے میں فائدہ اُٹھا سکوں گا، ان میں سے سید صاحب ایک تھے۔!

مذہب کی بات ہو یا سیاست کی، علمی مسائل ہوں یا کوئی اور بحث، سید صاحب بڑی سنجیدگی سے اظہارِ خیال کرتے تھے، اور دوسروں کا نقطۂ نظر سُننے میں بڑے تحمّل سے کام لیتے تھے، بحث میں وہ کبھی جزبُز نہ ہوتے، بلند آواز سے گفتگو نہ کرتے، کسی کی بات نہیں کاٹتے تھے، کوئی پھبتی، فقرہ یا دل آزاری کی بات نہ کہتے، گفتگو میں کوئی کتنا ہی ناواجب لب ولہجہ کیوں نہ اختیار کرتا سید صاحب کے رکھ رکھاؤ میں ذرا فرق نہ آتا تھا۔

سیّد صاحب کا تعلّق دارالمصنّفین سے تقریباً ۳۰، ۳۲ سال تک رہا۔ ان کی قیادت میں اس ادارہ کا یہ زمانہ کامرانی اور کارگزاری کے اعتبار سے بڑا شاندار رہا، مجھے یقین نہیں ہے کہ مستقبل قریب میں دارالمصنّفین کو یہ درجہ حاصل ہو سکے گا، معلوم نہیں کیوں اور کیسے سید صاحب نے کچھ دنوں کے لئے دارالمصنّفین سے علیٰحدہ ہو کر بھوپال میں ملازمت کر لی، جو بات سید صاحب خود ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے، اُس کو اُن کے سامنے مَیں کسی شکل میں نہیں چھیڑتا تھا، نہ اس ٹوہ میں رہتا کہ کیا ہوا، اور کیوں ہوا، میرا یہ رویّہ سیّد صاحب ہی کے ساتھ نہیں اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ بھی تمام عمر رہا، تاوقتیکہ مجھے اس کا یقین نہ ہو جاتا کہ وہ اپنی تمام دشواری میرے سامنے اس لئے نہیں پیش کرتے تھے کہ اُن کے خیال میں اس سے میرے تردّدات میں اضافہ ہونے کا امکان تھا،

ایسی صورت میں اُن کے فکر اور پریشانی کا پتہ لگانے کی ضرور کوشش کرتا ہوں۔

سیّد صاحب بھوپال تشریف لے گئے تو وہاں سے ایک خط لکھا جس میں اس کا بالکل تذکرہ نہیں کیا تھا کہ انھوں نے دار المصنّفین کیوں چھوڑا، اور بھوپال کی ملازمت اختیار کرنے کا باعث کیا ہوا، بلکہ کچھ اِس طرح کی باتیں تھیں کہ بھوپال میں وقت کس طرح کٹتا تھا، کام کرنے کے امکانات کیا تھے، آئندہ کا پروگرام کیا ہوگا، وغیرہ، البتہ یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ بھوپال میں زیادہ دن قیام کرنے کا ارادہ نہ تھا۔

عرصہ ہوا ایک بار سیّد صاحب سے عرض کیا تھا کہ وہ کسی طرح علی گڑھ آجائیں، جہاں اُن کی بڑی ضرورت تھی، پھر جب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ تشریف لائے تو موصوف بھی اس کے لئے کوشاں ہوئے کہ سید صاحب علی گڑھ آجائیں، لیکن یہ وہ زمانہ تھا، جب سیّد صاحب ارادہ کر چکے تھے کہ وہ پاکستان ضرور جائیں گے، بھوپال کے قیام کے دوران میں میں نے عرض کیا تھا کہ جس طرح یا جس لئے سیّد صاحب نے اپنی پوری زندگی دار المصنّفین کے لئے وقف کر دی تھی، وہ مسلّم ہے، لیکن مسلم یونیورسٹی میں رہ کر کام کرنا اور اس کی شہرت میں اضافہ کرنا، اس نصب العین کے خلاف نہ تھا، جو اُن کے سامنے تھا، کام کی نوعیت دونوں جگہ تقریباً یکساں تھی، علی گڑھ میں قیام کا مزید فائدہ یہ تھا کہ نوجوان طلبہ اُن کی تصنیف ہی سے نہیں اُن کی شخصیت سے بھی بہرمند ہوتے۔

ملک کی فضا ان دنوں کچھ ایسی ہو رہی تھی کہ سیّد صاحب کا بھوپال میں زیادہ دنوں تک قیام نہیں رہ سکتا تھا، میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ جب "میکدہ" چھٹا تو پھر ہرج کیا، "مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو!" لیکن سید صاحب نہ مانے، یوں تو ہوتا وہی ہے جو اللہ کی مرضی ہوتی ہے، لیکن یہ بات دل میں بار بار آتی رہی کہ

سیّد صاحب مستقلاً علی گڑھ آگئے ہوتے تو بحیثیتِ مجموعی اس سے بہتر ہوتا جو بعد میں پیش آیا!

سیّد صاحب بڑے سمجھدار، شریف اور محبّت کرنے والے انسان تھے، ان کی خدمت و خاطر کرنے میں مجھے بڑی لذّت اور بڑائی محسوس ہوتی تھی، کسی ذاتی معاملہ میں میرا اُن کا کبھی سابقہ نہ ہوا، ہوتا تو مجھے اپنے اوپر تو اعتماد نہیں لیکن سیّد صاحب کے بارے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میری خاطر وہ سب کر ڈالتے جو شاید اپنے لئے نہ کرتے، سیّد صاحب اپنی بڑائی اشارۃً یا جبراً کبھی نہیں بیان کرتے تھے، اور دل کھول کر کسی اور کی بُرائی بھی کم ہی کرتے تھے!

فطرتاً خاموش، قناعت پسند اور عافیت جو تھے، وہ اپنے بچّوں اور ساتھیوں کے ساتھ ہنس بول لینے میں زندگی کی تفریح پا لیتے تھے، اور خوش ہونے کے لئے کسی بڑی تقریب کے منتظر نہ رہتے تھے، چھوٹی خوشیوں میں بڑی خوشیاں ڈھونڈ لیتے تھے، یہ بہت بڑی صفت اور نعمت ہے اور کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے۔

اکثر یہ بھی محسوس ہُوا جیسے سیّد صاحب کسی قدر حزیں رہتے ہوں کیوں اور کیسے یہ نہیں بتا سکتا، یہ میں نے کبھی اُن سے پوچھا بھی نہیں، لیکن یہ حُزن ان میں طبعی نہ تھا، اس لئے کہ جب کبھی ملول نہ ہوتے تو صاف معلوم ہوتا کہ طبعاً شگفتہ مزاج ہیں، سیّد صاحب کے ہنسنے کا انداز ایسا تھا اور اس آسانی سے وہ ہنس پڑتے تھے کہ اُن کو کوئی الم پرست خشک مزاج یا کم آمیز نہیں کہہ سکتا تھا، ممکن ہے یہ زندگی کے آخری دَور کے تغیّرات کا نتیجہ ہو،

مذہب کا بیوپار کرنے والوں سے میں ذرا کم ہی یادِ اللہ رکھتا ہوں، ایسے لوگوں کو میں نے بالعموم احساسِ کمتری کا شکار پایا، اور یہ احساس انسان کے خصائل کو مسخ کر دیتا ہے کہ شرافت و شجاعت، درگزر اور دردمندی اور اس طرح

کی دوسری انسانی صفات جو مذہب و اخلاق کی روح ہیں اکثر لوگوں میں نہیں پائی جاتی ہیں جو اپنے آپ کو مذہب کا اجارہ دار بتاتے ہیں اور ان اخلاقی خرابیوں میں اُن کو مبتلا پایا، جس سے مذہب نے روکا ہے۔

اکثر یہ بات ذہن میں آئی ہے کہ مذہب بالخصوص اسلام جیسے مذہب کی پیروی کے لئے جس احساسِ ذمّہ داری اور احترامِ انسانیت کی ضرورت ہے وہ ایسے لوگ کیسے پورا کر سکتے ہیں، جو زندگی کی نہایت درجہ معمولی ذمّہ داریوں کو بھی سمجھنے اور نباہنے کی توفیق نہیں رکھتے، دنیا و عقبیٰ زمان و مکان کے اعتبار سے کتنے ہی مختلف ہوں لیکن یہ دونوں انسانی زندگی ہی کے دو رُخ ہیں اور انسان کے نتائجِ اعمال ہی کا نام عقبیٰ ہے، اس لئے ایک مسلمان کے لئے دنیا کا مرحلہ عقبیٰ سے بھی زیادہ سخت ہے اور جو شخص دُنیاوی ذمّہ داریوں سے خوش اسلوبی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، وہ عقبیٰ میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اس بحث کو پھیلانا نہیں چاہتا کہنا صرف یہ تھا کہ ادھر کچھ عرصہ سے ہمارے طبقہ میں جس نااہل کو نفع یا نمود کی کہیں گنجائش نہیں نکلتی وہ اِس مقصد کے لئے مذہب کو آلہ بنا کر ملک و ملّت کا محسن بن جاتا ہے، سیّد صاحب کس درجہ مذہبی آدمی تھے، لیکن کس طرح ان باتوں سے دور تھے، اس کا خیال کرتا ہوں تو اس کی یاد سے دل تروتازہ اور روح بالیدہ ہوتی ہے۔

مذہب کے معاملہ میں سیّد صاحب کا رویّہ نہایت شریفانہ، دانشمندانہ اور عالمانہ تھا، اُن کی ذاتی، قومی، تصنیفی، مذہبی زندگی اس پر گواہ ہے کہ اُنھوں نے اسلام اور اسلامی زندگی کی حفاظت و حرمت میں اپنی بہترین صلاحیتیں بے دریغ صرف کیں اور جہاں تک بن پڑا، مذہب کو خود غرض لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بننے نہیں دیا جس بات پر سب سے زیادہ حیرت ہوتی ہے، اور اسی اعتبار سے سیّد صاحب

کی وقعت بڑھ جاتی ہے، وہ یہ کہ باوجود اس کے کہ سید صاحب کی تعلیم و تربیت کسی ماڈرن یونیورسٹی میں نہیں ہوئی تھی، بلکہ قدیم طور طریقوں پر ہوئی تھی، وہ یونیورسٹی کے مقصد، معیار اور وقار کا کتنا احترام کرتے تھے؟ تفصیلات میں جانا نزاکت سے خالی نہیں لیکن اتنا کہنے میں مضائقہ بھی نہیں کہ انھوں نے اکثر مواقع پر یونیورسٹی اور اس کے خدمت گزاروں کی آبرو بڑی دلیری اور قابلیت سے بچائی!

یونیورسٹی میں رہ بس جانے کے سبب سے میں نے مسلمانوں کی گزشتہ ۲۰، ۲۵ سال کی سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں کا مشاہدہ بڑے اطمینان سے کیا ہے، اطمینان یوں کہ مجھے ازل سے ایمان، عقل آرٹ وغیرہ کا جو حصّہ ارزانی ہوا تھا، وہ ذرا واجبی ہی تھا، اس لئے کوئی تحریک یا تہلکہ کہیں اُٹھتا کیسا ہی اٹھتا، میں اپنے اس بہرہ کو بچائے رکھنے کی فکر کرتا تھا، یعنی نہ ان تحریکوں اور تہلکوں سے کبھی آنکھ مچولی کی، نہ زور آزمائی، نتیجہ یہ ہوا کہ عقل، صحت، آبرو سب بحال رہے، میرا خیال یہ ہے کہ قومی تحریکوں میں بیشتر سیاست والوں نے عوام، علماء اور طالب علموں کو آنکھ بند کر کے اور جی کھول کر اپنے اغراض کے لئے استعمال کیا، پھر یہ ہوا کہ پانسہ پلٹا اور عوام، علماء، اور طالب علموں کے دن پھرے، ان انھوں نے سیاستدانوں کی خبر لینی شروع کر دی، کہیں اور کا مجھے علم نہیں لیکن ہندوستان اور پاکستان میں یہی دیکھنے میں آرہا ہے کہیں کم کہیں زیادہ!

سید صاحب نے شروع سے سیاست میں حصّہ لیا، اور جنگ بلقان سے لے کر تقسیم ہندوستان تک ہر طرح کی سیاسی اور قومی تحریکوں کی نیچ اُونچ میں شریک رہے، کم خوش نصیب ایسے ہوں گے جنھوں نے سید صاحب کی طرح سیاست میں مسلسل حصّہ لیا ہو، اور سیاست کی آلائشوں سے پاک رہے ہوں،

سیاست کے وسیلے سے کسی منصب پر پہنچنے کے کبھی درپے نہ ہوئے، انھوں نے اپنے لئے جو بلند سطح پہلے دن اختیار کر لی تھی، اُسی پر اخیر دم تک قائم رہے، یہ سید صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے، اُنھوں نے تمام عمر رائے عامہ کو صحیح تربیت دینے میں صرف کی، معمولی طریق پر نہیں، بلکہ اپنی بلند پایہ تصانیف اور تقریر سے اپنی سیرت کی پختگی، اور پاکیزگی سے، سیّد صاحب ہماری قومی زندگی میں کس درجہ دخیل رہے ہیں، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے، اس کے ساتھ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ اس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہوئے جس سے وہ تعلّق رکھتے تھے سید صاحب کی تقریر، تحریر یا تصنیف سے کوئی فتنہ نہیں کھڑا ہوا۔

کچھ عرصہ سے سیّد صاحب نے وفیات کے عنوان سے معارف کے صفحات پر اہم شناسا شخصیتوں کی وفات کا تذکرہ تفصیل سے لکھنا شروع کر دیا تھا، یہ مضامین ہر اعتبار سے بڑے مفید اور اہم ہوتے تھے اور ہر حلقہ میں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے گئے، سیّد صاحب کو تاریخ اور سیرت میں جیسی بصیرت تھی اس کی بڑی اچھی جھلک ان تحریروں میں ملتی ہے، کس حُسنِ ترتیب اور تفصیل سے ان مرحومین کے زندگی کے واضح نقوش ان صفحات پر جگمگاتے نظر آتے ہیں!

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مرنے والوں کے سوانح زندگی کو سیّد صاحب کسی بیاض میں بڑی پابندی اور احتیاط سے قلم بند کرتے رہے ہوں اور وقت آنے پر اُن کو معارف میں نقل کر دیتے ہوں، سیّد صاحب میں یہ بات مجھے نہایت غیر معمولی نظر آئی، یعنی ان کا حافظہ کتنا قوی اور کس درجہ مرتّب تھا کہ ۳۰، ۴۰ سال کے واقعات بقیدِ سال و ماہ و مقام بے تکلّف اس طرح لکھتے جاتے، جیسے اُن کے سامنے وقوع میں آرہے ہوں یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مجھے اس کا یقین ہے کہ مرنے والے کا وہ بہی کھاتہ نہ رکھتے ہوں گے،

بلکہ ساری باتیں ان کے حافظہ میں جیتی جاگتی محفوظ ہوں گی!

ان مضامین کے لکھنے میں سیّد صاحب بہت زیادہ احتیاط ملحوظ رکھتے تھے، بہت کم ایسا ہوا ہے جہاں وہ مورّخانہ حدود سے بے اختیارانہ تاثرات کے حدود میں چلے گئے ہوں، ان مضامین کے بارہ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سیّد صاحب وہ فضا نہیں پیدا کر سکے یا پیدا نہیں ہونے دیتے تھے، جس کے بغیر یہ مضامین اتنے موثر نہیں ہوتے، جتنا ہونا چاہیئے اور جس کا اس طرح کے مضامین تقاضا بھی کرتے ہیں، اس نوعیت کے مضامین کی حیثیت تاریخی دستاویز کی اتنی نہیں ہوتی جتنی ایک طرح کی نذرِ عقیدت کی۔ تاریخی دستاویز میں ذاتی تاثرات کا دخل نہ ہونا چاہیئے لیکن جہاں ایک اعتبار سے نذرِ عقیدت پیش کی جارہی ہو، وہاں ذاتی تاثرات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، ان مضامین کو جہاں تاریخی دستاویز ہوکر نہ رہ جانا چاہیئے وہاں خالص شاعری یا نری بین و بکا بھی نہ ہونا چاہیئے، یہ تاریخ اور شاعری کے درمیان کی ایک چیز ہے جو تاریخ نہ ہونے کے باوجود تاریخ کی جگہ لے سکتی ہے، اور شاعری نہ ہونے کے باوجود شاعری کے تقاضے پورا کرتی ہے۔

یہاں ایک بار پھر اپنی عقیدت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ سیّد صاحب کا حافظہ کتنا قوی، ذہن کتنا مرتّب، تاریخی احساس کتنا بیدار اپنے اور بیگانوں سے تعلقات کتنے شریفانہ اور ان کی شخصیّت انسانیت کا کیسا اچھا نمونہ تھی کہ وہ اتنے پاکیزہ اور متوازن مضامین وفیات کے تحت لکھتے تھے!

ایک زمانہ سیّد صاحب پر ایسا آیا۔ جب ان پر درماندگی سی طاری رہنے لگی تھی، ذہنی اور جسمانی دونوں۔ اس زمانہ میں علی گڑھ بہت کم تشریف لائے، علی گڑھ سے باہر بھی کبھی ملاقات ہوئی، تو میں نے ان کو تھکا ہارا ہی پایا، غالباً

وہی دَور تھا، جب وہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب مرحوم و مغفور کے آستانۂ مبارک پر اکثر حاضر ہوتے۔ حضرت مرحوم سے شیفتگی بے اندازہ بڑھ گئی تھی، زیادہ وقت اوراد وظائف اور عزلت میں گزرنے لگا تھا، ممکن ہے یہی یا اس کے آس پاس کا وہ زمانہ بھی رہا ہو جب سیّد صاحب کو دل کی کچھ تکلیف ہوئی تھی، یہ بھی یاد آتا ہے کہ یہ زمانہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں بڑے انتشار کا تھا، مجھے سیّد صاحب کے اس رُجحان سے بڑا تردّد ہوا، میں نے ایک موقع پر غالباً انہی کا ایک فقرہ یاد دلایا تھا، کہ آپ کیا کر رہے ہیں، جب جہاد کی صف کو مرتّب اور مربوط کرنے کا وقت آیا تو آپ خانقاہ کی آبادی بڑھانے لگے۔

سیّد صاحب میرے اس طرح کے فقروں یا خطوط کا جواب نہیں دیتے تھے، دوستوں اور عزیزوں سے اُن کی خیریت دریافت کرتا تو یہی معلوم ہوتا کہ بے دلی اور افسردگی کا وہی عالم ہے، پھر خط لکھتا، کبھی کبھی لہجہ خشن بھی ہو جاتا لیکن سیّد صاحب کے ہاں سے کوئی جواب نہ آتا، ایک دفعہ علی گڑھ آگئے، طبیعت بحال تھی، میرا جی نہ چاہا کہ اپنے پچھلے خطوط کی یاد دلاؤں، سیّد صاحب نے خود اس قصّہ کو چھیڑا، میں نے اپنے رویّہ کی معافی مانگی، کہنے لگے نہیں نہیں، باتیں سب ٹھیک تھیں، لیکن آپ کو کیا معلوم کہ مجھ پر کیا عالم گزرا، پھر مُسکرا کر فرمایا ؎

"دیوانگی ہم عالمے وارد!"

میں بھی ہنس پڑا اور سیّد صاحب کو کسی قدر شگفتہ پا کر عرض کیا، سیّد صاحب ایک بات آپ سے کہے بغیر نہ رہوں گا، وہ یہ کہ جو لوگ آپ کے منصب کو پہنچ چکے ہیں، اُن پر کچھ ہی کیوں نہ گزر جائے، وہ کسی حال میں اپنی پسپائی کا اظہار یا اعلان میرے جیسے گئے گزرے لوگوں کی طرح اور اُن کے سامنے نہیں کر سکتے، آپ کو تو اسی جگہ کھڑا رہنا ہے جہاں آپ کی اُمّت آپ کو کھڑا

دیکھنا چاہتی ہے! سوال یہ نہیں ہے کہ آپ پر کیا گزرے گی، سوال یہ ہے کہ آپ کی اُمّت کدھر جائے گی، سیّد صاحب نے بات ہنسی میں ٹال دی۔

شکل صورت، وضع قطع، چال ڈھال، بات چیت ہر اعتبار سے سیّد صاحب کی شخصیت بڑی دل آویز اور قابلِ احترام تھی، ان کو دیکھ اور پا کر ایک طرح کی تقویت محسوس ہوتی تھی کہ وہ شفقت کریں گے، رُسوا نہ کریں گے، اور جب تک ساتھ رہیں گے، زندگی میں بڑائی اور حلاوت محسوس ہوگی، جیسے وہ اپنی طرح طرح کی ذمّہ داریوں کا احساس رکھتے ہیں، اپنی ہی نہیں، ہماری ذمّہ داریوں کا بھی احساس، وہ ہمیشہ صرف ستھرے رہتے تھے، اور ظاہر اور باطنی دونوں اعتبار سے لباس، بستر، ساز و سامان صاف ستھرا، اور سجل رکھتے تھے، ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نفاست بھی ہوتی، بستر بند کٹا پھٹا، میلا کچیلا تڑا مڑا نہ ہوتا، ہینڈ بیگ چمڑے کا پُرانا لیکن ستھرا اور پالش کیا ہوا، تکیہ کا خلاف اور چادر، نہایت صاف، اوڑھنے بچھانے کا سامان آرام دہ، وافر، خوشنما، لوٹا گلاس، ناشتہ دان، صابون دان سب منجا ہوا، تولیہ لمبا چوڑا دبیز اور بہت صاف دُھلا ہوا، سفر کتنا ہی مختصر ہو، بکس میں پہننے اوڑھنے بچھانے کا کافی سامان رکھتے تھے، کلامِ پاک اور اوراد و وظائف کی کتاب بڑے سُتھرے اور خوب صورت جزدان میں ہوتی، عبادت ہمیشہ چُھپ کر کرتے، جس کے مہمان ہوتے، اس کے لئے تحفہ ضرور لے جاتے، تشریف لاتے تو نام بہ نام سب کی خیریت پوچھتے، اور چونکہ وہ میرے ہی دیار سے آئے ہوتے، اس لئے میرے تمام دوستوں، عزیزوں اور بزرگوں کی خیریت سناتے، کسی کا پیغام سُناتے، کسی کا تحفہ اور کسی کی فرمائش پہنچاتے، فرمائش ساتھ دی جاتی، تو بڑی خوشی سے ساتھ لے جاتے اور بڑی حفاظت سے پہنچا دیتے! سفر میں نوکر ہمراہ نہ ہوتا، ہر کام خود کر لیا کرتے تھے، جہاں ٹھہرتے

وہاں ہر شخص ہر خدمت کے لئے حاضر رہتا، میں نے یا تو ہمیشہ سپید عمامہ میں دیکھا، یا نج کی صحبت میں سفید دو پلیہ ٹوپی میں، جو مجھے سیّد صاحب پر خاص طور سے بڑی دلکش نظر آئی، کپڑا ہمیشہ بہت اچھا سِلا ہوا پہنتے، اور دوسرے ہی دن شاید بدل دیتے تھے، اس لئے کہ میں نے سیّد صاحب کے جسم پر میلا تو درکنار کبھی ملگجا لباس بھی نہیں دیکھا، موزہ بالعموم پہنتے، جو ہمیشہ صاف و ثابت ہوتا، رومال نہایت صاف رکھتے تھے، اور بہت جلد بدل دیتے تھے۔

کھانا بڑے سلیقہ سے کھاتے تھے، اور دسترخوان کے آداب اس خوبی اور نفاست سے برتتے تھے کہ دل خوش ہو جاتا تھا، جو چیز جتنی چمچے میں آجاتی، اتنی ہی پلیٹ میں رکھ لیتے، کھانا کتنا ہی لذیذ یا ان کا مرغوب کیوں نہ ہوتا، لیتے تھوڑا ہی، جی چاہتا تو تھوڑا سا دوسری بار لے لیتے، جو چیز پسند آجاتی اس کی بڑے شگفتہ اور شریفانہ انداز سے تعریف کرتے، دسترخوان پر زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو مخاطب کر کے نرم لہجہ میں لطف و محبت کی باتیں کرتے، جن دوستوں نے شبلی منزل کی صحبتیں اور وہاں کی مہمان نوازی دیکھی ہے، وہ جانتے ہوں گے کہ دسترخوان پر سید صاحب کا رکھ رکھاؤ کوئی نئی یا تعجب کی بات نہ تھی!

سیّد صاحب میں ایک خوبی ایسی تھی، جس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں یعنی مہمان ہو کر وہ میزبان کے فرائض غصب کر کے اپنی صیانت و حکم برداری میں نہیں لے لیتے تھے، جیسا کہ اکثر نہایت درجہ گرم اور مخلص مہمان کیا کرتے ہیں، یعنی خود ہر کھانا میزبان کے سامنے پیش کرنا اور اصرار کرنا کہ وہ ضرور کھائیے اور نہ کھائیے تو وجہ بتائیے، اور وجہ بتائیے تو یہ تعزیت کا ریزولیشن پاس کریں، یا کوئی چورن تجویز کریں۔

اس طرح کی باتیں بیان کرنا ضروری نہ تھا، لیکن میں کسی آدمی کی سیرت اور شخصیت کا اس سے بھی اندازہ لگاتا ہوں کہ وہ میزبان یا مہمان کی ذمّہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے اور کس حد تک دسترخوان کے آداب ملحوظ رکھتا ہے، میں اپنے مہمانوں سے خواہ ان میں محترم خواتین ہی کیوں نہ ہوں، حتی الوسیع اصرار نہیں کرتا کہ وہ فلاں چیز ضرور کھائیں، یا کتنی کھائیں، کھانا سامنے ہے، اور انہی کے لئے ہے، بڑے شوق اور اخلاص سے پیش کیا جا رہا ہے، اب اگر وہ اس درجہ شرمیلے، شاندار اور سادہ لوح واقع ہوئے ہیں کہ بغیر قول قسم یا منت سماجت کے کچھ نہیں کھانا چاہتے تو ذمّہ داری اُن کی ہے، میری نہیں، میں مہمان کا خیر مقدم کرتا ہوں، اس لئے کہ میں اُس کی طرح طرح سے خدمت اور خاطر کروں گا اور اپنے طور پر اپنے لئے خوش ہوں گا، نہ اس لئے کہ مہمان کو کھانا کھلانے سے ثواب ملتا ہے، اور عاقبت سنورتی ہے!

میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہیں خواہ وہ کتنے ہی پڑھے لکھے یا ملک و ملت میں مقتدر کیوں نہ ہوں جو دسترخوان کے آداب سے واقف ہوں اور اُن کو برت سکتے ہوں، کھانے پر کھانے یا نہ کھانے والوں کے ساتھ تبختر بے جا تکلف یا بے تکلفی برتنا بڑی کم سمجھی کی بات ہے، جس کو لوگ بے تکلفی سمجھتے ہیں، وہ بڑا نازک مرحلہ ہے، اس کو سمجھنا اور نباہنا بڑا مشکل کام ہے، بے تکلفی کا تعلق فن سے نہیں تہذیب سے ہے! کھیل میں، کھانے پر اور سفر میں ہر شخص کا عیب و ہنر کھل جاتا ہے، خواہ وہ اس کے چھپانے کی کتنی کوشش کیوں نہ کرے، میں نے سیّد صاحب کو میزبان اور مہمان دونوں حیثیتوں سے برتا ہے وہ میری میزان پر پورے اُترے ہیں، سیّد صاحب کی جو بڑائی میرے دل میں ہے، اس میں سیّد صاحب کی اس خوبی کا خاصا اونچا درجہ ہے!

سیّد صاحب نے دار المصنّفین کا کام غالباً ۱۹۱۵ء میں سنبھالا، اس وقت سے لے کر تقسیمِ ملک تک کم و بیش ۳۲ سال وہ اس ادارہ میں یا یہ ادارہ سیّد صاحب میں اس طرح گھلے ملے رہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے تمیز کرنا مشکل تھا، دار المصنّفین کا خیال کیجئے تو ذہن بھی فی الفور سیّد صاحب کی طرف منتقل ہوتا تھا، اور سیّد صاحب کو دیکھتے تو دار المصنّفین سامنے آجاتا تھا، کسی ادارہ کی روایت و شخصیّت اسی طرح وجود میں آتی اور برگ و بار لاتی ہے۔

شبلی منزل ایک خاص علمی ادارہ ہونے کے علاوہ زندگی کی بہت سی دوسری اعلیٰ و صحت مند سرگرمیوں کا بھی گہوارہ تھا، کتنے دانایانِ سیاست، اربابِ فضیلت، اور شیدائیانِ شعر و ادب وہاں سے نسبت رکھنا، اپنے لئے ایک امتیاز سمجھتے تھے، جن دوستوں کو شبلی منزل میں قیام کا اتفاق ہوا ہے اور جنھوں نے وہاں کی مدارات و مہمان نوازی، رفقار کا آپس کا میل محبّت اور کام کرنے کا شغف دیکھا ہے، وہ بتا سکیں گے کہ اعظم گڑھ کا یہ مختصر سا خطّہ جو کسی طرح ایک اوسط درجہ کے باغ کے رقبہ سے زیادہ نہیں ہے، شمالی ہند کی روایتی تہذیب و دانش و بینش کی نہ صرف نمائندگی کرتا رہا بلکہ اس میں خاطر خواہ اضافے کرتا رہا!

کوئی مہمان عزیز آجاتا تو دار المصنّفین کے سارے لوگ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے، کھانے متنوع، اور بہت اچھے پکے ہوئے، نیچے پایا کی ہموار اور یکساں چوکیوں پر نہایت تکلّف سے اعلیٰ درجہ کا سفید دسترخوان بچھایا جاتا جس پر بڑے خوبصورت اور ستھرے برتنوں میں یہ کھانے چنے جاتے، لوگ حسبِ مراتب قالین اور چاندنی پر چوکیوں کے گرد بیٹھ جاتے، سیّد صاحب

میزبانی کے فرائض انجام دیتے؛ یہ تقریب اور اس طرح کی تقریب محض کھانے پینے کی نہ ہوتی، بلکہ آدمی کی بہت سی ذہنی گتھیاں سلجھ جاتیں اور زندگی کی جدو جہد میں حصّہ لینے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا!

مل جل کر بیٹھنے، کھانے پینے اور بات چیت کرنے کے فوائد کا اندازہ بہت کم لوگ کر سکتے ہیں، علی گڑھ کی جن خصوصیات اور خوبیوں کو متفقّہ طور پر سراہا گیا ہے، ان کو بروے کار لانے میں علی گڑھ کی اس روایت کو بڑا دخل ہے کہ یہاں ساتھ کھانا کھانے اور دستر خوان کے پورے آداب برتنے کا خاص طور پر التزام رکھا جاتا ہے!

رات میں میرے ہاں جب کھانا ختم ہو لیتا اور سیّد صاحب کے معتقدین اپنے گھروں کو چلے جاتے تو بعض مسائل پر اطمینان سے دیر تک گفتگو ہوتی، کوئی اور نہ ہوتا، اس لئے سیّد صاحب سے بات کرنے میں مَیں ذرا بے تکلفی اور بے باکی کو بھی دخل دے جاتا، سید صاحب بڑی توجہ سے تمام باتیں سُنتے؛ کبھی کبھی کوئی فقرہ بڑے لُطف کا، اور کبھی ایک آدھ بڑی حسرت سے کہہ جاتے!

ایک رات زیادہ دیر تک اسی طرح کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی سیّد صاحب نے ان تمام تعلیمی طریقوں کا ذکر کیا، جو گذشتہ عہد کے مسلمانوں میں رائج تھے، پھر موجودہ حالات پر تبصرہ کرتے رہے، سیّد صاحب کی اس رات کی گفتگو بڑی عالمانہ اور دل نشین تھی، وہ رہ رہ کر اس پر زور دیتے کہ جب تک تعلیم بطور شرف و سعادت حاصل نہ کی جائے گی، معاشرہ کا قوام اعتدال پر نہ آئے گا، محض روٹی کمانے یا دولت جمع کرنے کی نیّت سے تعلیم دینا یا تعلیم حاصل کرنا ہمیشہ بے برکتی کا موجب ہو گا۔

میں نے عرض کیا سیّد صاحب آج کل معمولی سے معمولی کام بھی مخصوص تعلیم و تربیت حاصل کئے بغیر اختیار نہیں کیا جا سکتا، اور دنیا میں کاموں کی نوعیت اتنی بڑھ گئی ہے، اور تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے کہ اب محض تعلیم کی خاطر تعلیم کون حاصل کرے، یہ تو نہ ممکن ہے نہ مناسب، سیّد صاحب نے اس سے اتفاق کیا لیکن فرمایا کہ اُن کا مطلب تعلیم کے ابتدائی مدارج سے تھا، مثلاً آٹھویں نویں جماعت تک جہاں پہنچ کر بچّوں کی اخلاقی بنیاد ایک حد تک استوار ہو جاتی ہے، پھر فرمانے لگے۔ ہمارے ہاں بچّوں کو تعلیم دینے اور اُن کا اخلاق سدھارنے کا کام یا تو ماسٹر کے سُپرد ہے، یا مُلّا کے اور دونوں ایسی معاشی زبوں حالی اور اس کے عواقب میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ ایسی اہم خدمات ٹھکانے سے انجام نہیں دے سکتے، جہاں سب سے زیادہ ذمّہ داری کا کام سب سے معذور ہاتھوں میں دیا جائے گا وہاں اصلاح و فلاح کی کیا صورت نکل سکتی ہے!

یہ رات مجھے خاص طور پر یاد رہ گئی ہے، وقت زیادہ گذر گیا تھا! اور سیّد صاحب تہجّد کی تیاری کرنا چاہتے تھے، میں اُٹھ کھڑا ہوا، تو فرمانے لگے :-

"رشید صاحب! شب آخر گشت و افسانہ از افسانہ می خیزد! زندگی کا بھی عجیب ڈھنگ ہے، جب کچھ باتیں قابو میں آنے لگتی ہیں، اور حوصلہ ہوتا ہے کہ اب انھیں پیش کریں گے تو رخصت ہونے کا پیغام آجاتا ہے، جس شوق اور محنت سے جو کچھ دیکھا، سیکھا، پڑھا تھا، اب وہ برگ و بار لانے والا تھا کہ عمر کا آفتاب غروب ہونے لگا! اس برگ و بار کا

کیا ہوگا، جب سے تمدّن کا آغاز ہوا، اور جب تک دنیا کا
یہ کارخانہ قائم رہے گا، اس طرح کے کتنے حسرت ناک سانحے
آتے رہے ہیں اور آتے رہیں گے!"

میں گھبرا سا گیا، سید صاحب کے اس موڈ (کیفیتِ ذہنی) سے میں خود بچنا چاہتا تھا، اور سید صاحب کو بھی بچانا چاہتا تھا، میں نے کہا سیّد صاحب! آپ کے دل میں جو بات آئی ہے کون ایسا شریف اور صاحبِ علم و فن ہے جس کے دل میں نہ آئی ہوگی۔ عظیم شخصیت اور عظیم فن کار اس کیفیت میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن آپ تو اللہ کی مشیت و مصلحت کے مجھ سے زیادہ قائل ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ آپ بہتوں سے زیادہ اس کے مقرب بندوں میں ہیں، آپ اس کا غم کیوں کریں کہ آپ جتنا دے سکتے تھے، وہ دے نہ سکے۔ غم اُسے ہو جس نے ایسا ہونے نہ دیا۔ جب تک ارادہ اور عمل آپ کے بس میں رہا، آپنے فرائض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی بلکہ فرض سے زیادہ کر دکھانے کے آرزومند رہے، جب آپ کو یا مجھے کارآمد و کارآفریں رکھنے کے بجائے معطل و معذور کر دیا گیا۔ (موت واقع ہوئی) تو ہمارا کیا قصور اور جب ہمارا قصور نہیں تو انجام کچھ ہی ہو، زندگی کی مہم میں فتح ہماری ہی رہی!

سیّد صاحب مسکرائے لیکن یہ مسکرانا کسی اور سبب سے اتنا نہ تھا جتنا شاید میرے اظہارِ قابلیت، طلاقتِ لسانی پر، لیکن میں بھی نہ جھجکا، بلکہ دل ہی دل میں کسی قدر جھنجھلا کر بولا، سیّد صاحب مایوسی اور مصائب کا علاج منطق، فلسفۂ الٰہیات وغیرہ میں ڈھونڈنے سے علّامہ لوگوں کو مل جاتا ہو تو مل جاتا ہو اس خاکسار کو آج تک نہیں ملا، سیّد صاحب نے میرے لہجے کی تلخی یا بے باکی کو غالباً محسوس کر لیا تھا، مسکرا کر بولے، اور کیوں جناب آپ نے

"علامہ" اور "خاکسار" میں کوئی رعایت تو مدِنظر نہیں رکھی ہے! مجھے بے اختیار ہنسی آگئی، میں نے کہا سید صاحب جب تک آپ کا ذہن ایسے موقعوں پر آپ کا ساتھ دیتا رہے گا، آپ کو اپنی طرف سے اطمینان ہو یا نہیں مجھے آپ کی طرف سے اطمینان رہے گا۔

پھر میں نے کہا، سید صاحب آپ نے جو بات کہی وہ مجھ سے اُٹھائے تو نہیں اُٹھتی لیکن مجھے تو اس مسلمان جنرل کی بات پسند آئی جس نے یہ عہد کر لیا تھا کہ جہاں تک خشکی ملے گی وہ خدا کے نام پر فتح کرتا چلا جائے گا، فتح کرتے کرتے خشکی کا حصہ ختم ہو کر سمندر آگیا، تو اُس نے گھوڑے کو پانی میں ڈال دیا اور کہا، بارِ خدایا خشکی ختم ہوگئی، میرا عہد بھی ختم ہوتا ہے، سید صاحب اللہ کے ساتھ اس کے سپاہیوں کا یہی معاہدہ ہوتا ہے، اس کے بعد نام اللہ کا!

سید صاحب پھر مسکرائے اور فرمایا "اب جاکر آرام کیجئے، آج بڑی دیر ہو گئی!"

بالآخر یہ ہوا کہ سید صاحب پاکستان تشریف لے گئے۔ یہ جانتا تھا کہ سید صاحب جائیں گے ضرور، گو معلوم نہیں کیوں یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ سید صاحب خوش نہ رہیں گے۔ تقسیم ملک کے بعد ایک بار کسی قدر اطمینان کی ملاقات ہوئی، اثنائے گفتگو میں فرمایا، رشید صاحب عجب بے بسی کا عالم ہے، بن بیاہی لڑکیاں اور بوڑھے ماں باپ تو یہاں رہ گئے، نوجوان پاکستان چلے گئے، کیا کیا جائے، کیا ہوگا، اس طرح کی بعض دوسری مصیبتوں کا ذکر بھی بڑی مایوسی سے کیا، سید صاحب کی اس گفتگو سے میرا دل بھر آیا، اِس لئے اور کہ سید صاحب اس طرح کی باتیں اکثر نہیں کرتے تھے، معلوم نہیں کیوں اور کیسے میرے دل میں وسوسہ سا پیدا ہوا کہ دیکھئے آئندہ سید صاحب پر کیا گزرتی ہے!

سید صاحب پاکستان گئے تو مدتوں خبر نہ آئی۔ ایک دن اخبار میں پڑھا کہ اُردو کے مسئلہ پر تقریر کرنے کے دوران میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ نے سید صاحب کو تکلیف پہنچائی، بڑا قلق ہوا، سید صاحب کے لئے یوں کہ کس منزلت کا آدمی کہاں جا کر کس بنا پر رُسوا ہوا، اور طلبہ کے لئے یوں کہ طالبعلم بالخصوص یونیورسٹی کے طالب علم سے بڑھ کر قیمتی متاع کسی قوم اور ملک کی کیا ہوگی، اس نے یہ سلوک سید صاحب سے کیا، جن کی علمی، مذہبی، قومی، تہذیبی خدمات اس صدی میں اتنی زیادہ اور اتنی گرانمایہ تھیں کہ کسی ایک شخص کی نہ تھیں، پھر علماء کی رسوائی سلاطین کے ہاتھوں تو سُنی تھی، طلبہ کے ہاتھوں کبھی سُننے میں نہیں آئی تھی، اب تک طالب علم کو عالم کی ناموس کا سب سے بڑا محافظ خیال کرتا تھا!!

اگر ایک عالم کی موت عالَم کی موت ہے تو ایک عالم کی بے حرمتی کو کیا کہیں گے!

افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق

مدراس کے ریلوے اسٹیشن پر ایک اجنبی مسلمان اس فکر میں مضطرب پھر رہا تھا کہ رات بسر کرنے کے لئے کوئی جگہ مل جائے، اسٹیشن کے چھوٹے بڑے اہل کار کسی نہ کسی سبب سے اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے، اتنے میں ایک طرف سے ایک ہندو نوجوان نمودار ہوا، اجنبی کی پریشانی دیکھ کر قریب آیا، وجہ دریافت کی، صورتِ حال معلوم ہونے پر اسے ایک جگہ اطمینان سے بیٹھ جانے کو کہا اور خود دیر تک آفسوں کا چکر لگاتا رہا کبھی بابوؤں سے ردّ و قدح کرتا، کہیں منت سماجت، بالآخر واپس آیا اور مسلمان کو مطلوبہ جگہ پر پہنچا دیا، مسلمان نے حیرت اور شکر گزاری کے ساتھ ہندو دوست سے متعارف ہونا چاہا تو بڑے اصرار کے بعد اس نے بتایا مجھ پر ایک زمانہ بڑے آلام و افلاس کا گزرا ہے، نہ کوئی سہارا دینے والا تھا نہ دلاسا، اس مایوسی اور بے بسی کے عالم میں ڈاکٹر عبدالحق کی خدمت میں پہنچا اور اپنی مصیبت بیان

کی، سب کام چھوڑ کر بڑی شفقت سے پیش آئے، اُمید بندھائی اور روزگار کا ایسا بندوبست کر دیا کہ میری زندگی کی کایا پلٹ گئی، میں نے ان کے احسان کو اس طرح محسوس کیا جیسے مجھ میں بڑی اچھی صلاحیتیں اُبھر آئی ہوں اور مایوسی و بیزاری سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا مل گیا ہو، پھر میں نے ایک عہد کیا کہ جب تک جیوں گا جس مسلمان کو تکلیف اور تردّد میں دیکھوں گا حتیّ الوسع اس کی مدد کروں گا!

پچھلے سال کا ذکر ہے میری لڑکی اور داماد ایک طویل سیاحت سے فارغ ہو کر جاپان سے سیلون پہنچے، خط بھیج کر خواہش ظاہر کی کہ کوئی ایسا انتظام کر دوں کہ ایک دو روز مدراس میں قیام کر کے وہاں کی سیر کر لیں، میں نے ڈاکٹر صاحب کو لکھا، سب جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا شمار مدراس کے مصروف ترین لوگوں میں ہوتا تھا، پبلک سروس کمیشن کی ذمہ داریوں کے علاوہ اپنے یا دوسروں کے معلوم نہیں کتنے اور کام اپنے ذمہ لے رکھے تھے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کی کوٹھی چھوٹے بڑے طرح طرح کے لوگ طرح طرح کے کاموں سے صبح سے رات تک برابر آتے جاتے رہتے اور ڈاکٹر صاحب ان سب سے بڑی توجہ اور تلطف سے پیش آتے، جیسے کسی ایسے معالج کا مطب ہو جہاں ہر مریض کا علاج مفت کیا جاتا ہو اور مطب صبح سے رات گئے تک مسلسل کھلا رہتا ہو۔ یہی نہیں بلکہ علاج کی نوعیت بھی جداگانہ ہو۔ مثلاً دوا، دعا، گنڈا تعویذ، دان پُن، سعی سفارش، رشتہ ناتا، اتنا ہی نہیں بلکہ بیچ بیچ میں آؤٹ ڈور پریکٹس پر بھی نکل جاتے، کسی سے چندہ مانگنے کے لئے، کسی سے سفارش کرنے، کہیں تقریر کرنے، کہیں شادی غمی میں شریک ہونے، کبھی کسی مہمان کو مدراس کی سیر کرانے!

ڈاکٹر صاحب کسی ضروری کام سے مدراس سے باہر جانے والے تھے، میرا خط ملا تو پروگرام ملتوی کر دیا، ہوائی جہاز کے اڈے پر پہنچے اور دونوں کو اپنے گھر لائے، ڈاکٹر صاحب کے لئے بالکل آسان تھا اور اس میں نزاکت یا قباحت کا کوئی پہلو نہیں نکلتا تھا کہ گھر والوں کو ضروری ہدایت دے کر دورے پر چلے جاتے، میں جانتا ہوں مہمانوں کی خاطر مدارات میں کسی قسم کی کمی نہ آتی۔ اس لئے کہ بیگم صاحبہ کی عزت اور محبت کے سلوک سے میں خود ایک بار بہرہ مند ہو چکا تھا۔ اس وقت کس حسرت سے وہ موقع یاد آتا ہے جب میرے لئے ہر طرح کی سہولت فراہم کر کے ڈاکٹر صاحب نے پہلے پہل مدراس بلایا تھا، میری اس "زحمت فرمائی" سے ان کو کتنی مسرت ہوئی تھی، جیسے "زفرق تا بقدم" شاداب و شادماں ہو گئے ہوں! اخلاص اور اخلاق برتنے کا ڈاکٹر صاحب کا ٹکنک جُداگانہ تھا، وہ اپنے الطاف و اکرام کا پورا اندوختہ کامل اعتماد اور افتخار سے پہلی ہی بار ہر اُس شخص پر لگا دیتے تھے، جس کو اس کی ضرورت ہوتی، ان کے اس طریقۂ کار سے جرمنوں کے اس معروف اصولِ جنگ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جہاں بتایا گیا ہے کہ دشمن کے کمزور پہلو پر حرب و ضرب کی اپنی پوری طاقت یکبارگی مرکوز کر دو!

ڈاکٹر صاحب نے اسی پر اکتفا نہ کی، اپنے گھر پر ان کے لئے ایک طرح کی پکنک کا انتظام کیا، میری لڑکی داماد اور نواسہ نیز اپنے لڑکے لڑکیوں کو پاس بٹھا لیا، انگیٹھی منگائی، کھانے پکانے کی طرح ڈالی، پکاتے جاتے اور بتاتے جاتے کہ مدراس میں مسلمانوں کے یہ کھانے اور مٹھائیاں نوابوں کے دورِ حکومت سے مشہور چلی آتی ہیں، یہ چیزیں کھانے کی میز پر دوسری چیزوں کے ساتھ چُنی جاتیں، اصرار سے کھلاتے اور ان کی لذت اور لطافت

بیان کرتے، کبھی سبھوں کو ساتھ لے کر مدراس کی سیر کو نکل جاتے۔ مختلف مقامات کی تاریخی اہمیت بتاتے، اپنے جمع کئے ہوئے طرح طرح کے تاریخی نوادر اور مسلمانوں کے عہد کی قلمی کتابیں، نقاشی، وصلیاں، مغربی مصوری کے بعض شاہکار دکھاتے اور ان کی صراحت اس لطف سے کرتے جیسے تاریخی حقائق نہیں بلکہ لطیفے بیان کر رہے ہوں!

باوجود ان باتوں کے مجھے نہیں لکھا کہ اُنھوں نے میری فرمائش کس خلوص اور خوبی سے پوری کر دی تھی، اپنا کتنا ہرج کیا تھا، یا پھر اس طرح کی فرسودہ رسمی معذرت کرتے کہ اُنھوں نے کیا ہی کیا تھا، گھر میں جو دال دلیا تھا، وہ پیش کر دیا، بہت کم قیام کیا، مہمان کو بڑی تکلیف ہوئی اُمید ہے کہ معاف فرمائیں گے وغیرہ! مدراس میں قیام اور ڈاکٹر صاحب کی مہمان نوازی اور شفقت کی تفصیل مجھے اپنی لڑکی سے معلوم ہوئی جس نے علی گڑھ پہنچتے ہی سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب اور اُن کے گھر والوں کی ثنا خوانی شروع کر دی، جیسے ڈاکٹر صاحب کے نہیں بلکہ اپنے کارنامے کا ذکر کر رہی ہو۔

اتفاق یہ کہ ڈاکٹر صاحب کو جلد ہی ایگزیکٹو کونسل کی میٹنگ میں شرکت کے لئے علی گڑھ آنا پڑا جس دن تشریف لائے اس سے ایک روز پہلے لڑکی داماد علی گڑھ چھوڑ چکے تھے، سُنا تو متاسّف ہوئے، ان کے متاسّف ہونے کا معصوم بزرگانہ متبسم انداز نہیں بھولتا۔ فرمایا، اس دفعہ علی گڑھ آنے کا شوق یوں اور بھی زیادہ تھا کہ سبھوں سے یہاں ملتا، میں نے کہا کہ سب آپ کی بیگم صاحبہ اور بچّوں کی بڑی تعریف کرتے تھے، کہنے لگے ارے بھی تو ان کو بتانے آیا تھا کہ گھر والے ان سب کو کتنا یاد کرتے ہیں۔

عبدالحق صاحب کو ذاکر صاحب یہاں کی پرو وائس چانسلری پر بڑے

اصرار و اعتماد سے لائے تھے، میرا خیال ہے کہ کسی اور کے کہنے سے وہ اپنے طرح طرح کے پھیلے ہوئے کاموں کو چھوڑ کر جن سے ان کو بڑا شغف تھا، یہاں آنے پر رضا مند نہ ہوتے، اس لئے اور کہ ان کاموں کو سنبھالنا اور ترقی دینے والا اس نواح میں ان کے سوا کوئی نہ تھا۔ آئے تو ذاکر صاحب نے اپنا مہمان بنا کر رکھا، اس زمانے میں یونیورسٹی ایک نازک دور سے گزر رہی تھی، پرانی بساط اٹھ رہی تھی، نیا نظام استوار نہیں ہو پاتا تھا۔ ذاکر صاحب یہاں کے دروبست پر حاوی نہیں ہو پائے تھے کہ بیمار ہو گئے، طویل علالت کے بعد صحت بحال ہوئی تو امریکہ جانا پڑا، عبدالحق صاحب نے وائس چانسلری کا کام سنبھالا۔

اس حصّہ ملک اور اس یونیورسٹی میں ڈاکٹر عبدالحق صاحب اجنبی نہ تھے تو کچھ زیادہ معروف بھی نہ تھے، البتہ خاص خاص حلقوں میں لوگ اتنا جانتے تھے کہ مدراس میں مسلمانوں کے لئے ہر طرح کی تعلیمی سہولت فراہم کرنے میں ڈاکٹر صاحب کا بڑا حصّہ ہے، اسلامی علوم و ادب پر اچھی نظر ہے، علومِ جدیدہ سے آشنا ہیں اور ہر جماعت میں وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

یہاں آئے تو لوگوں نے دیکھا کہ شکل صورت، وضع قطع، رہن سہن، شرعی مسلمانوں جیسی، پرانی چال کی ترکی ٹوپی سر پر، داڑھی، ڈنڈا، اٹنگا پاجامہ پان کھانا، حقّہ پینا، مصافحہ کرنا، جو جہاں بلائے بے تکلف چلے جانا، ہر مجلس میں ہر چھوٹے بڑے سے ہنسا بولنا، کسی نے میلاد پڑھنے کو کہا وہ پڑھ دیا، کسی نے وعظ کہنے پر اصرار کیا وہ کہہ دیا، کسی بچہ کی بسم اللہ کرا دینے کی درخواست کی، وہ پوری کر دی، ڈاکٹر صاحب کی خوبصورت خورد سال نواسی (نیلوفر) بہت مانوس ہو گئی تھی، کاموں سے فرصت ہوتی تو اُسے

کبھی گود میں لئے ہوئے کبھی اُنگلی پکڑ کر صبح شام لان پر ٹہلتے ہوئے اس کی خاطر تفریح کی باتیں کرتے رہتے، کبھی وہ فرطِ مسرت سے بے اختیار ہو کر داڑھی پکڑ کر پوری طاقت سے کھینچتی تو اُسے خوش کرنے کے لئے کراہتے اور ہنستے، کہتے ارے اب معلوم ہوا تیرے ہی ڈر سے تیرے نانا نے داڑھی چھوٹی رکھی ہے کہ تو کھینچ نہ پائے، اچھا رہ جا اب تجھے گود میں نہ لوں گا، پیٹھ پر بٹھاؤں گا، پھر دیکھوں گا تو میری داڑھی پر کیسے قبضہ کرتی ہے۔ ان کا یہ مشغلہ اور مذاق برابر جاری رہتا چاہے ملنے کے لئے کوئی طالب علم آجاتا یا اسٹاف کا ممبر یا ضلع کا افسر یا شہر یا مضافات کا کوئی رئیس، ملنے والے سے بھی باتیں کرتے جاتے اور بچی کی تفریح بھی بنے رہتے۔

ایک طرف نیلوفر جیسی خوبصورت چنچل ذہین بچّی تھی، دوسری طرف ڈاکٹر صاحب کی نورانی شکل اور لطف و رحمت سے لبریز آزمودہ کار محکم شخصیت، میں جب کبھی بچی کو ڈاکٹر صاحب کی گود میں یا اُن کی اُنگلی پکڑے لان پر ٹہلتے دیکھتا تو ایسا محسوس کرتا جیسے قدیم، جدید کو زندگی اور زمانے سے روشناس کرا رہا ہو۔ نیز پرانی اور نئی قدروں کا ایک دوسرے سے کس سطح پر کیا رشتہ ہے۔ ادھر یہ قصہ تھا، اُدھر یہ بات پھیلی کہ ڈاکٹر عبدالحق تو قال اللہ وقال الرسول قسم کے مولوی تھے، علی گڑھ کو کیا جانیں اور ماڈرن یونیورسٹی کے طور طریق کو کیا سمجھیں، کچھ ایسے لوگ جو دنیا کو ہر لعنت سے پاک اور ہر نعمت سے بہرہ یاب کرنے پر اپنے آپ کو مامور اور دوسروں کو فتورِ عقل و نیت میں مبتلا سمجھتے تھے ڈاکٹر صاحب سے ملے اور اس طرح گفتگو شروع کی جیسے ان پر علومِ جدیدہ کے بصائر و معارف کے وہ دریچے کھول رہے تھے جن تک ڈاکٹر کی رسائی نہ تھی۔ یا عالمی نظم و نسق کے وہ نکتے واضح کر رہے تھے جن سے ڈاکٹر صاحب

بے بہرہ تھے، یہ بھی کافی نہ سمجھ کر کہیں کہیں خیرہ چشمی کی بھی جھلک دکھا دیتے۔ ڈاکٹر صاحب یہ ساری باتیں بڑے تحمّل اور شفقت سے سُنتے، کبھی مُسکراتے، کبھی داد دیتے، ایک آدھ کلمہ ایسا بھی کہہ دیتے جس میں مسلمانوں کی اخلاقی روایات اور وقت کے مطالبات کے علاوہ یونیورسٹی کے تحفّظ اور ترقی کے مسائل کی طرف اشارے ہوتے۔

وقتاً فوقتاً اس طرح کے انٹرویو ہوتے رہے اور فضا کچھ اس طرح بدلنے لگی کہ وہ لوگ جو اسلامی روایات کو قصّۂ ماضی سمجھتے تھے، ڈاکٹر صاحب کی ذات میں ان اقدار اور روایات کو ناقابلِ تسخیر سمجھنے لگے۔ یہاں تک کہ بعض نے پچھلے طرزِ عمل پر اظہارِ پشیمانی کیا اور معافی کے خواستگار ہوئے۔ کچھ دنوں بعد جب ڈاکٹر صاحب یہاں سے تشریف لے جا چکے تھے، یہ فرمائش کی گئی کہ اسٹریچی ہال میں انگریزی میں تقریر فرمائیں۔ موضوعِ بحث کچھ اس طرح تھا "کیا فقہ اسلامی رومن لا سے ماخوذ ہے"؟ ڈاکٹر صاحب فرمائش پوری کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ ایک ایک دن کے وقفے سے غالباً تین لیکچر دیئے۔ اسٹریچی ہال حاضرین سے لبریز ہوتا، بغیر کسی یاداشت کے سہل اور شُستہ انگریزی میں بے تکلّف تقریر کرتے، کتنی مدلّل پُرمغز اور فکر انگیز وہ تقریریں تھیں، جہاں تک مجھے معلوم ہے، قانون کا ڈاکٹر صاحب کا کوئی خصوصی مطالعہ نہ تھا۔ اس تقریر نے ان کی قابلیت اور شخصیت کا نقش لوگوں کے دلوں پر ہمیشہ کے لئے بٹھا دیا، کتنے خوش ہوتے تھے جب کوئی طالبِ علم کسی علمی موضوع پر ان سے رہنمائی کا خواستگار ہوتا، دقیق سے دقیق مسائل کی تشریح آسان سے آسان طریقوں اور مثالوں سے کرتے۔ کم لوگ ایسے ہوں گے جن کا علم اور اخلاق طلبہ کو اس طرح "اُڑ کر" لگتا ہو، جتنا کہ ڈاکٹر صاحب کا!

ڈاکٹر صاحب کو میں نے علی گڑھ میں بھی کام کرتے دیکھا اور مدراس میں بھی، عجیب بات یہ تھی کہ وہ کام بہت زیادہ کرتے تھے لیکن مصروف بالکل نہیں نظر آتے تھے، برخلاف دوسروں کے جو کام بہت کم کرتے ہیں یا بالکل نہیں کرتے لیکن مصروف ہمہ وقت نظر آتے ہیں۔ وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مصروفیت کام سے نہیں ہے، احساسِ ذمہ داری سے ہے، یہ احساس اپنی ذمہ داری سے متعلق نہ ہو تو دوسروں کی ذمہ داری سے سہی! عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ کوئی شخص کام کرتے کرتے تھک گیا ہو اور اُٹھنا چاہتا ہو، اسی وقت کوئی دوسرا کام یا صاحبِ غرض آجائے تو وہ قدرتاً جھنجھلا پڑتا ہے، ڈاکٹر صاحب پر یہ حالت کبھی طاری نہیں ہوئی، کتنا ہی کام کتنی ہی دیر تک کیوں نہ کر چکے ہوں، کوئی اور کام یا صاحبِ غرض آجائے تو وہ اس سے اسی تازہ روئی سے متوجہ ہو جاتے تھے جیسے وہ اس سے پہلے صرف تفریح کر رہے تھے، کام اب شروع کریں گے، یہ بات میں نے بہت ہی کم لوگوں میں پائی، کہا کرتے تھے کہ مجھے نہ کام کھلتا ہے نہ صاحبِ غرض! کام کا نہ کھلنا تو سمجھ میں آتا ہے، اس لئے کہ صحت اور سکون میسّر ہو تو کام کرنا اور کرتے رہنا زندگی کے نعائم میں سے ہے، لیکن بہ ثباتِ ہوش و حواس جس پر صاحبِ غرض نہ کھلتا ہو اُس کو اولیاء اللہ کے طبقے میں جگہ دیتا ہوں۔ صاحبِ غرض سے یہاں میری مراد خود غرض سے ہے، اہلِ حاجت سے نہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں علم اور دین کا چرچا تھا۔ اس عہد میں علم کا سرچشمہ دین تھا، ہر دین کا مقصد خدا کی اطاعت اور خلق کی خدمت ہے، یہ فضا جوہرِ قابل کے لئے یوں ہی کیا کم سازگار ہوتی ہے کہ اس پر معاشی تنگ حالی سونے پر سہاگے کا کام کر گئی۔ ابتدائے زندگی

میں تنگ دستی سے بہتر اور سستی تربیت گاہ میں نے آج تک نہ دیکھی، بشرطیکہ تنگدستی کا یہ زمانہ محنت اور ایمانداری سے کاٹ دینے کی اللہ توفیق دے، اس پر ایک عزیز نے طنزاً فرمایا کہ اللہ کی توفیق ہی درکار ہو تو محنت مزدوری کے بجائے براہِ راست دولت اور فراغت ہی کی دعا کیوں نہ مانگی جائے۔ میں نے کہا کہ بات ٹھیک ہے، لیکن اللہ کے لئے عافیت اسی میں ہے کہ وہ مجھے محنتی اور ایماندار بنا کر خود کفیل بنا دے اور میری طرف سے بے فکر ہو جائے۔ آپ کو دولت و فراغت براہِ راست دے کر وہ اپنی نت نئی مشکلات میں اضافہ کرنا کیسے پسند کرے گا!

علم اور دین کے مطالبات ڈاکٹر صاحب نے تمام عمر جس پابندی اور خوبصورتی سے پورے کئے وہ مجھے کہیں اور کم نظر آئی، میری تقدیر کو بنانے میں اسلام کا جو تصوّر پیش کیا گیا ہے یا جو میری سمجھ میں آسکا ہے اس سے بڑا تصوّر انسان کے ذہن و تخیّل میں نہیں آسکتا۔ انسان اور اپنے شایانِ شان اس پیمانے پر صرف خدا سوچ سکتا تھا، بایں ہمہ مجھے کوئی مسلمان نہ ملا جس کو میں اس اسلام کا نمونہ پاتا جو میرے ذہن میں تھا، اسلام ہی نہیں، میں ہر مذہب کا بڑا احترام کرتا ہوں اور اپنے اس عقیدے کو اپنی بڑی جیت سمجھتا ہوں، لیکن مجھے اچھے مذہبی آدمی نہ ملے، بیشتر یہی محسوس ہوا جیسے مذہبی آدمی اپنے کو دوسرے سے علیحدہ اور ممتاز سمجھتا ہو، جیسے اس میں "برہمنیت" راہ پاگئی ہو، اور وہ اپنے آپ کو مامور من اللہ سمجھتا ہو، لیکن وہ اتنی معمولی سی بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ اگر وہ خدا کی طرف سے مامور کیا گیا ہے تو اس کا مامور ہونا اس کی آزمائش پہلے ہے فضیلت بعد میں! فضیلت برہمن کے حصّہ میں اور آزمائش شودر کے نصیبے میں آئے یہ کہیں اور ہوتا ہو تو ہو اسلام میں نہیں ہوتا، مامور من اللہ

ہونے کی ذمہ داری لینا یوں بھی کوئی دانشمندی نہیں ہے۔

اس گفتگو کا مقصد یہ بتانا تھا کہ ڈاکٹر عبدالحق کیسے انسان اور مسلمان تھے، ان کو دیکھ کر میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوتی تھی کہ کاش میں بھی ایسا مسلمان ہوتا، اور یہ میں نے اس لئے کہا کہ تمام عمر بے شمار مسلمانوں سے ملنے اور ان کو دُور اور قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، کوئی مسلمان ایسا نہ ملا جس کو دیکھ کر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ ایسا مسلمان میں بھی ہوتا! اس کے ساتھ اس حقیقت کا بھی یہاں اعتراف کرتا ہوں کہ بہت ممکن ہے میرا سابقہ ایسے مسلمان سے اب تک نہ ہوا ہو، ورنہ ایسے مسلمان بے شمار ہوں گے، ممکن ہے اس کا سبب یہ بھی ہو کہ ڈاکٹر عبدالحق نے بحیثیت انسان اور مسلمان مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہو، دوسرے اس حد تک متاثر نہ ہوئے ہوں، یہ سب صحیح ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ میں ذاتی پسند اور ناپسند کو بہت بڑی حقیقت سمجھتا ہوں، انقلابی حقیقت! مجھے تو یہاں تک محسوس ہوا کہ جو لوگ مسلمان نہیں شاید وہ بھی ڈاکٹر عبدالحق جیسا مسلمان بننا پسند کرتے ہیں! اچھے مسلمان اور اچھے انسان کو میں نے ہمیشہ ایک دوسرے سے اتنا قریب پایا کہ کم سے کم میرے لئے اکثر ان میں امتیاز کرنا دشوار ہو گیا ہے!

ڈاکٹر صاحب نے دین کے معاملے میں کوئی سمجھوتہ نہ اپنے آپ سے کیا تھا نہ کسی دوسرے سے، جیسا کہ ہم آپ اکثر کر لیا کرتے ہیں، یعنی عقائد اور اعمال کی ذمہ داریوں سے بقدر ستّر فیصدی اپنے آپ کو مستثنیٰ قرار دیئے جانے کا ریزولیشن باختیار خود پاس کر دیتے ہیں، ستّر فیصدی غالباً یوں کہ مسلمانوں کو ہر نیکی کا اجر عموماً ستّر گنا ہی ملتا ہے! وہ اسلام کے بتائے ہوئے عقائد پر کامل یقین رکھتے تھے اور ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے ان پر

عامل تھے، بایں ہمہ وہ اتنے خوش مزاج، زود آمیز، مخلص، ہوش مند اور ہمدرد تھے، جیسا ہمارا آپ کا کوئی عزیز بے تکلف دوست، وہ کسی حال میں محتسب نہیں معلوم ہوتے تھے بلکہ سر سے پاؤں تک محبّ و مشفق تھے ا جیسے ان سے دور یا علیحدہ رہنا بدنصیبی اور ان کا اعتبار حاصل کرنا محرومی ہو۔ ان کے مخالفوں کے لئے بڑی مشکل یہ تھی کہ نہ ان کو متعصب قرار دے کر اپنا مطلب نکال سکتے تھے، نہ پُرانے خیال اور پُرانی چال کا آدمی کہہ کر ان کو نظر انداز کر سکتے تھے، ان کی نظر جتنی علومِ دین، تاریخ اور سیر پر تھی، اس سے کچھ کم واقفیت دنیوی علوم سے نہ تھی، یونیورسٹیوں کے قواعد و قوانین اور سرکاری تعلیمی دفاتر کے آئین و ضوابط پر اُن کو پورا عبور تھا، اُن سے کوئی یہ کہہ کر بازی نہیں لے جا سکتا تھا کہ اس ملک یا کسی دوسرے ملک کا جدید ترین اُصول، نظام یا نصابِ تعلیم یہ یا وہ تھا، جس سے وہ آشنا نہ تھے، ڈاکٹر صاحب کو چھوٹی بڑی ہر طرح کی تعلیم گاہوں کے تمام مدارج اور معلومات سے گہری اور عملی واقفیت تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک جگہ کالج میں تعلیم شروع کرنے کا اپنا بڑا دلچسپ اور عبرت انگیز قصّہ لکھا ہے، بیان کرنے میں طوالت ہو گی اس لئے نظر انداز کرتا ہوں۔ یہ اسی حادثہ کا فیضان ہے کہ اُنھوں نے دوسروں کے لئے تعلیم کو آسان اور ارزاں بنانے میں تمام عمر اپنی اچھی سے اچھی صلاحیتیں صرف کیں، علوم شرقیہ سے قطع نظر جہاں تک علومِ جدیدہ کو مسلمانوں کے لئے آسان اور ارزاں بنانے کی کوشش اور کامیابی کا تعلق ہے، اور اس غرض سے اُنھوں نے جتنے کالج قائم کئے، وہ ایسا کارنامہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کا ہمسر نہ ریاست مدراس میں (شاید باہر بھی) نہ پہلے کوئی گزرا ہے نہ آج موجود

ہے! ان کے کاموں میں میں نے جتنی برکت دیکھی بہت کم کہیں اور نظر آئی۔ اچھے کاموں میں وہ تائیدِ غیبی کے قائل تھے، اور اس کی بعض ایسی آپ بیتی سنایا کرتے کہ عقل دنگ رہ جاتی، ہر اچھا اور بڑا آدمی تائیدِ غیبی پر ایمان رکھتا ہے!

ڈاکٹر صاحب کو میں نے کبھی مایوس، مغموم یا متنغض نہیں پایا سوائے ایک بار کے جب وہ متفکر نظر آئے، تمام دن ان پر یہ کیفیت طاری رہی، دوسرے روز حسبِ معمول ہشاش بشاش نظر آنے لگے۔ صورتِ حال کچھ اس طرح پیش آئی تھی کہ اُس کو جوں کا توں رہنے دیا جاتا تو اس ادارے کے ایک بنیادی مقصد کو نقصان پہنچتا تھا، دوسری طرف اس کو دُور کرنے یا بدلنے کی کوشش میں اس کا خدشہ تھا کہ کہیں ادارے کی شہرت مجروح ہو جائے فرماتے تھے، دن بھر اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہا، رات کو کھانے اور نمازِ عشاء سے فارغ ہو کر اس مسئلے کا حل سوچنے بیٹھا، تمام شب اُدھیڑ بن میں گزر گئی، فجر ہوتے حل سمجھ میں آیا اور اس کا فارمولا مرتب کر سکا، میں نے عرض کی فارمولے میں ایک آدھ جگہ فامولا کم، جرأت زیادہ نظر آتی ہے، فرمایا آپ نے ٹھیک کہا لیکن ہر مؤثر اور کارآمد فارمولے میں دو تہائی سوجھ بوجھ اور ایک تہائی جرأت کا ہونا ضروری ہے۔ حسبِ ضرورت آپ اِس تناسب کو گھٹا بڑھا سکتے ہیں لیکن یہ چاہیں کہ بغیر جرأت کے کام بن جائے تو یہ ممکن نہیں!

ایک صاحب کا بیان ہے کہ ذاکر صاحب امریکہ سے واپس آرہے تھے، ڈاکٹر صاحب اُن کو لینے دہلی گئے، ایک صاحب اور ساتھ تھے، جہاز سے اُترتے ہی ذاکر صاحب نے علی گڑھ کا حال پوچھا۔ جو صاحب ساتھ تھے اُنھوں نے حالات اور واقعات کو مایوسانہ انداز میں بیان کرنا شروع

ہی کیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے بات کا رُخ بدل دیا؛ اور اپنے مخصوص اندازِ خوش دلی و خوش اعتمادی سے بولے نہیں صاحب حالات ایسے نہیں ہیں کہ فکر مند ہوا جائے۔ یہ تو زندگی کے معمولات میں سے ہیں، جہاں اتنے تعلیم یافتہ نوجوان اکٹھا رہتے سہتے، کھاتے پیتے، پڑھتے لکھتے، کودتے پھاندتے ہوں وہاں اس طرح کے واقعات پیش آتے ہی رہیں گے۔ اور اب تو ذاکر صاحب آگئے ہیں۔ سارے معاملات یوں بھی رو براہ ہو جائیں گے۔ یہ کہہ کر ذاکر صاحب کو موٹر میں بٹھایا اور علی گڑھ واپس آگئے اور ذاکر صاحب نے دیکھا کہ صورتِ حال وہی تھی جو ڈاکٹر صاحب نے بیان کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب عربی فارسی کے عالم متبحر، اردو شعر و ادب کے شیدائی اور انگریزی اُردو کے بڑے اچھے مقرر تھے، ان کی تقریریں دل نشین، بے تکلف اور پُر مغز ہوتی تھیں، ان کا مطالعہ اتنا وسیع، معلومات اتنی متنوع، ذہن اس درجہ رسا اور طبیعت ایسی شائستہ اور شگفتہ تھی کہ وہ کسی موضوع برجستہ بھی تقریر کرتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے یہ موضوع ان کے مدتوں کے مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ اُردو یا انگریزی میں گفتگو یا تقریر کرتے تو لب و لہجہ سے ظاہر ہوتا جیسے اُنھوں نے تمام عمر مدراس اور اس کے نواح میں نہیں بلکہ دہلی، لکھنو یا اس کے آس پاس میں بسر کی تھی۔

تقریر میں ڈاکٹر صاحب فلسفہ، منطق یا سائنس کے اسرار و غوامض کو دخل نہ دیتے۔ خطابت کے فن سے واقف ہونے کے باوصف اس کے حربوں سے کام نہ لیتے، نہ کسی شخص یا جماعت کا مذاق اُڑاتے، نہ کسی کو رُلانے ہنسانے کی کوشش کرتے۔ غرض آرائشِ گفتار کے لئے جو باتیں

درکار ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ان میں سے کسی کے محتاج نہ تھے، سیدھی سادی بات کہتے لیکن ان کے کہنے کا انداز ایسا تھا اور اعتماد و اعتبار کی ایسی فضا پیدا کر دیتے تھے کہ بات دلوں کی گہرائی میں اُتر جاتی اور خبر نہ ہوتی، ایسا کچھ احساس ہوتا جیسے چونکہ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں اس لئے اس کے صحیح اور معقول ہونے میں شک نہیں کیا جاسکتا۔

میرے نزدیک کسی شخص کا دلّی یا لکھنؤ کا ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ اُس کا اُردو کا لب ولہجہ بھی معیاری ہوگا، گفتگو میں صحتِ زبان ہی کافی نہیں ہے، لب ولہجہ کا شستہ ہونا بھی ضروری ہے، دلّی کے بعض مشہور اشخاص یا گھرانوں سے قطع نظر دلّی والوں کا لب ولہجہ بالعموم خشک اور خشن ہوتا ہے، اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ اُردو چونکہ "کھڑی بولی" پر مبنی ہے اس لئے دلّی اور اس کے اطراف کے رہنے والوں کا لب ولہجہ بھی کھُرّا اور کھڑا ہوتا ہے، دوسری طرف جو لوگ کھڑی بولی کے علاقے سے علیحدہ لیکن متجانس پراکرتوں کی سلاست اور شیرینی سے آشنا ہیں وہ اُردو کے مناسبِ حال لب ولہجہ پر زیادہ قدرت رکھتے ہیں، شمالی ہند کی پراکرتوں کے علاوہ چونکہ اُردو کا گہرا تعلق فارسی عربی زبانوں سے بھی ہے اس لئے بحیثیت مجموعی اُردو لب ولہجہ کے لوازم ایسے ہیں کہ ان سے عہدہ برآ ہونا بھی آسان نہیں ہے۔ بُتوں کی مانند اُردو لب ولہجہ کے بھی ایسے کتنے شیوے ہیں جن کو اب تک نام نہیں دیا جا سکا ہے، ڈاکٹر صاحب مدراس کے ہوتے ہوئے صحیح اور فصیح اُردو بولتے ہیں، یہاں تک کہ تلفظ کی کوئی "ضرب خفی یا جلی" ایسی نہ ہوتی جس سے اس کا شبہ ہو سکتا کہ وہ شمالی ہند کے اس خطے سے تعلق نہیں رکھتے تھے جہاں کا اُردو لب ولہجہ

معیاری ہے!

کسی ماضی کی اہمیت کا مدار محض اس کے ماضی ہونے پر نہیں ہے، بلکہ اس پر ہے کہ کس حد تک وہ حال اور مستقبل کی صحیح اور صحت مند رہبری کرسکتا ہے، حال و مستقبل کی اہمیت اس بنا پر ہے کہ دونوں ماضی کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں، اس لئے اصولاً یا کلیتہً ماضی سے روگردانی نہیں کرسکتے، ڈاکٹر صاحب کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کے گذشتہ دینی، علمی اور تہذیبی کارناموں کا بڑا احترام تھا، یہ بات کچھ تو ان کے مطالعے اور مشاہدے کا براہِ راست نتیجہ تھی، اور کچھ اس خلقی ورثے کا تصرف تھا جو ان کو اپنے خاندان کے اکابر سے ملا تھا، اپنے ان تصوّرات کی تشکیل میں وہ طرح طرح سے کوشاں رہتے، چنانچہ ۱۹۴۲ء میں محمڈن کالج کی سلور جوبلی کے موقع پر اُنھوں نے اسلامی تہذیب و تمدّن کی ایک نمائش ترتیب دی تھی جس میں ایسے تاریخی شواہد اور نوادر اس سلیقے سے اس پیمانے پر پیش کئے گئے تھے کہ اس سے پہلے کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئے تھے۔ اس نمائش کی تفصیلی روداد معارف کے صفحات میں شائع ہوچکی ہے۔ وہ نمائش تو اب میسّر نہیں لیکن چاہتا ضرور ہوں کہ اسلامی تہذیب و تمدّن کے طالبِ علم اس نمائش کی تفصیل کا مطالعہ معارف کے متذکرہ شمارے میں کریں۔

مجھے جو شے یا شخص اچھا نظر آتا ہے جی چاہنے لگتا ہے کہ وہ علی گڑھ کا ہو جائے، اس سلسلے میں ایک بار عرض کیا تھا، ڈاکٹر صاحب مدراس کے سب سے اچھے آدمی کو (جہاں تک مجھے علم ہے) علی گڑھ نے پالیا۔ اب اتنا اور چاہتا ہوں کہ آپ کی یہ نمائش بھی کسی طرح علی گڑھ آجائے، میری دانست میں یونیورسٹی کے ادارۂ علوم اسلامیہ کا اسے ایک مستقل اور ممتاز جزو ہونا

چاہیئے۔ رفتہ رفتہ یہ شعبہ اسلامی تہذیب و تمدن کے ایک اعلیٰ درجے کے میوزیم کی شکل اختیار کر سکتا ہے، بہت خوش ہوئے فرمایا یہ تجویز نہایت مفید اور مناسب ہے، اس کے لئے تھوڑا بہت سرمایہ فراہم کرنا پڑے گا، دوڑ دھوپ درکار ہوگی، شخصی اثرات کو کام میں لانا پڑے گا۔ ہندوستان سے باہر دوسرے ممالک سے بھی مدد لینی پڑے گی، کچھ دنوں کی مسلسل کوشش کے بعد جو چیز آپ کے ذہن میں ہے وہ عملاً سامنے آسکے گی، پھر ڈاکٹر صاحب علی گڑھ سے چلے گئے اور اب جب کہ وہ اس جہان میں نہ رہے، اس اسکیم کی حیثیت ایک خواب سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے پاس عربی، فارسی، اُردو کتابوں کا بڑا نادر قلمی اور مطبوعہ ذخیرہ تھا، اس طرح کے نوادر پر ان کی معلومات نہایت وسیع تھیں، میں نے ان صحبتوں میں بھی ان کو دیکھا ہے جہاں مخطوطات کے اچھے اچھے "اصحابِ خبر و نظر" موجود ہوتے، سبھی ڈاکٹر صاحب کی وسیع اور تفصیلی معلومات پر متعجب ہوتے، ایک بار کچھ اسی طرح کا تذکرہ تھا، فرمانے لگے تعلیم حاصل کرنے انگلستان گیا تو وہاں دو ہی باتوں کی زیادہ فکر رہتی، ایک یہ کہ عربی فارسی، اُردو کے نوادر کہاں کہاں محفوظ ہیں، دوسرے یہ کہ مشہور مستشرقین کون کون تھے، اور ان تک رسائی کیونکر ہو!

فرمانے لگے ہندوستان میں مخطوطات تک پہنچنے میں چند باتوں نے میری رہبری کی، اس طرح کے مخطوطے والیانِ ریاست یا روٗسا تک کھنچ کر پہنچ جاتے کیونکہ زمانۂ حال تک یہی لوگ علم و ہنر کے مربّی ہوتے یا پھر اس طرح کے نوادر خانقاہوں میں یا سجادہ نشینوں کے ہاں ملتے۔ اس لئے کہ یہ بزرگانِ دین خود صاحبِ علم و فضل ہوتے اور اس طرح کے لوگوں کا

ہادی و ملجا بھی۔ امورِ دین کی تلقین بھی اُردو ہی میں کرتے تھے، اس لئے کہ ان کے فرمودات بیاضوں میں محفوظ ہوتے۔ میرے خاندان کے بزرگوں کا تعلق مختلف اور متعدد خانقاہوں اور سجادہ نشینوں سے کسی نہ کسی حیثیت سے رہا ہے، اِس لئے اس طرح کے علمی اندوختوں سے مجھے واقفیت رہی ہے، ایک بات اور ہے جس پر لوگ بہت کم توجہ کرتے ہیں، مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں ہندو حکمران اور رؤسا بھی اس طرح کے مخطوطات کے شائق ہو گئے تھے چنانچہ بعض بڑے قیمتی اور نایاب قلمی اور مطبوعہ نسخے ان کے کتب خانوں میں آج بھی مل جائیں گے۔ مگر ان کے تلف ہو جانے کا امکان اب بہت بڑھ گیا ہے۔

ایک بار میں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب عربی فارسی سے آپ کا شغف تو سمجھ میں آتا ہے، اس کی سیاحی میں معلوم نہیں کتنی پشتیں گزری ہیں، یہ اُردو کا شوق کہاں سے آیا، فرمایا۔ مدراس اور اس کے نواح میں اُردو کا چرچا قدیم الایام سے رہا ہے۔ یہاں کے مسلمان جب تک اُردو میں دستگاہ نہ پیدا کر لیتے تعلیم اور تہذیب میں اپنے کو کامل نہ سمجھتے، اُردو میں شاعری کرنا مہذّب اور تعلیم یافتہ ہونے کی نشانی سمجھتے ہیں، جس طرح مسلمانوں کے بعض قبائل میں یہ دستور ہے کہ جب تک کوئی نوجوان حج کر کے نہ آجائے قبیلے میں شادی کا مستحق نہیں قرار پاتا البتہ اس مرتبے کے شاعر ادھر نہیں ہوئے جیسے شمالی ہند میں ہوئے، پھر بھی اُردو شاعری کو وہاں بڑی وقعت اور قبولِ عام نصیب رہا ہے، مسلم یونیورسٹی نے اُردو کی ایک جامع تاریخ لکھنے کا اہتمام کیا ہے، مدراس اور ارکاٹ کے مصنفین اور شعراء اور ان کی تصانیف کے بارے میں میں آپ کو بڑی بڑی مفید اور اہم معلومات فراہم

کروں گا، ایک زمانے میں وہاں کی اُردو تاریخ لکھنے کا ارادہ ہوا تھا، اس کے لئے کافی مواد بھی دستیاب ہوگیا، لیکن پھر دوسرے کاموں میں ایسا پھنسا کہ ادھر متوجہ نہ ہو سکا۔ مٹیریل کے علاوہ بہت سی باتیں ذہن میں محفوظ ہیں، پھر ہنس کر فرمایا! اگر پبلک سروس کمیشن مدراس کی مستقل صدارت نہ ملی تو کمیشن سے مستعفی ہو کر اس تاریخ کا کام کروں گا۔

سوچتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے علی گڑھ میں کم و بیش چھ ماہ قیام کر کے ہمارے دلوں میں جب اپنے لئے پاکیزہ۔ اور قابلِ احترام خیالات و جذبات پیدا کر لئے جو اتنی کم مدّت میں علی گڑھ میں آج تک کوئی اور نہ پیدا کر سکا تو ان

لہ آہ! کسے معلوم تھا کہ جس دن یہ صدارت تفویض ہوئی اسی دن ڈاکٹر صاحب کے لبوں پر دفعتاً وہ تبسم نمودار ہوا جسے اقبالؔ نے "نشانِ مردِ مومن" بتایا ہے۔ اصغرؔ مرحوم کا یہ شعر آج کتنے دنوں کے بعد یاد آیا ہے ؎

کائناتِ دہر کیا روح الامین بیہوش تھے
زندگی جب مسکرائی ہے قضا کے سامنے

زندگی کی کوئی آزمائش ڈاکٹر صاحب سے ان کی خلقی مسکراہٹ چھین نہ سکی، لیکن ان کی آخری مسکراہٹ نے زندگی سے اس کی ہر آزمائش چھین لی! بعض دوستوں، عزیزوں کی وفات ایسی ہوتی ہے کہ خود اپنا جیتا رہنا بے غیرتی معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی رحلت کی خبر سُن کر اسی طرح کی بے غیرتی کا احساس ہوا!

اس موقع پر جزع و فزع، صبر و شکر، ایمان و یقین کے کتنے فقرے بے ارادہ یاد آتے ہیں لیکن کسی ایک کو لکھنے کا جی نہیں چاہتا — خاکم بدہن! حادثہ اتنا بڑا ہے اتنا چھوٹا توازن کیسے قائم رہے، خوشی میں کبھی توازن نہیں کھوتا، غم میں قائم نہیں رکھ سکتا۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے، وہ تو جانتا ہے اس طرح کا غم مجھ ناتواں کے لئے کیسی بے پناہ آزمائش ہے!!

لوگوں کا حال ہوگا جن میں رہ کر اور جن کے لئے انہوں نے تمام عمر کام کیا، معلوم نہیں کتنے اور کام! یہ بات اور زیادہ احترام اور اچنبھے کی اس وقت معلوم ہونے لگتی ہے۔ جب ہم یہ جانتے ہوں کہ علی گڑھ کے لوگ کسی سے "راضی وخوشنود" ہونے میں ذرا دیر لگاتے ہیں، بہ نسبت مدراس اور نواحِ مدراس کے مسلمانوں کے جو زیادہ سیدھے سادے اور بہت جلد عقیدت اور احسان مندی کے جذبات سے متاثر ہو جاتے ہیں، ڈاکٹر صاحب کے یوں دفعتاً وفات پا جانے سے ان پر کیا عالم گزرا ہوگا!

کسی آدمی کے بڑے ہونے کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کو غریبوں اور بچوں سے کتنی محبت ہے، ڈاکٹر صاحب کو ان دونوں سے بڑا شغف تھا۔ صاحبزادی کی شادی کی تو اسی دن اور اسی وقت بستی کی سات غریب لڑکیوں کی بھی شادی کرائی، ہر طرح کی مالی امداد پہنچائی اور ان کی برابر خبر گیری کرتے رہے، ڈاکٹر صاحب یقیناً دولت مند نہ تھے، لیکن اچھے کاموں میں روپیہ صرف کرنے کا بڑا حوصلہ رکھتے تھے، ایک بار کچھ اسی طرح کا ذکر آگیا تو فرمانے لگے میں بڑا دولت مند ہوں، اس لئے کہ میری اپنی دولت کے علاوہ دوستوں اور عزیزوں کی دولت بھی میرے لئے وقف رہتی تھی!

سائنس کانگرس کے سالانہ اجلاس میں ہندوستان کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں کے نمائندے شریک ہوتے ہیں، اس کا گزشتہ اجلاس مدراس میں منعقد ہوا تھا، حسبِ دستور مسلم یونیورسٹی کے نمائندے بھی شریک ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی وہاں موجودگی علی گڑھ کے لوگوں کے لئے مزید کشش کا باعث تھی، جن کی خاطر تواضع، آرام و تفریح کو ڈاکٹر صاحب نے اپنی ذمہ داری قرار دے لیا تھا، زیادہ سے زیادہ جتنے اصحاب کی گنجائش ڈاکٹر صاحب

کے گھر میں ہو سکتی تھی وہ وہاں ٹھہرے، بقیہ کا انتظام دوسرے تمام شرکا، کے ساتھ کانگرس نے علیحدہ کیا تھا۔ پبلک سروس کمیشن کی مصروفیت اور دوسرے کاموں سے تھوڑی سی بھی مہلت مل جاتی تو وہ علی گڑھ کے دوسرے نمائندوں کی خیر خیر لینے نکل جاتے، جیسے ان سب کے میزبان مدراس میں وہی تھے، ایک دن علی گڑھ کے تمام لوگ ڈاکٹر صاحب کے ہاں ڈنر پر مدعو تھے، معلوم ہوا کہ دو چار اصحاب جو دور مقامات پر ٹھہرے ہوئے تھے، غالباً سواری کا انتظام نہ ہونے کے باعث آنہ سکے، ڈاکٹر صاحب بڑے مضطرب ہوئے اور گاڑی لے کر روانہ ہو گئے، سب کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائے، کھانا ختم ہونے کے بعد ان کو اُن کی قیام گاہ پر چھوڑ آئے اور طرح طرح سے بار بار معذرت کرتے رہے کہ ان کے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ ان کے مہمانوں کے لئے سواری کا انتظام کرنا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو علی گڑھ میں جو منزلت اتنی جلدی میسر ہوئی اس کے میرے نزدیک بعض واضح اسباب ہیں۔ باوجود ہمہ وقت کام میں مصروف رہنے کے وہ چھوٹے بڑے ہر شخص کے لئے اتنے ارزاں اور سہل الحصول تھے جتنی سانس کے لئے ہوا، ہمیشہ محبت اور عزت سے پیش آئے تھے، لوگوں کے دُکھ درد کو حتیٰ الامکان دُور، ورنہ کم کرنے کی کوشش کرتے، ان پر لوگوں کو بھروسہ تھا کہ وہ کسی شخص یا جماعت کی ناواجب پاسداری نہ کریں گے، لوگ جانتے تھے کہ وہ قاعدہ قانون سے نہ صرف پورے طور پر واقف تھے بلکہ ان کی پابندی سمجھداری اور ہمدردی سے کرتے تھے، کوئی شخص خواہ کتنا ہی مفسد اور متفنّی کیوں نہ ہو ڈاکٹر صاحب کو بدنام نہیں کر سکتا تھا! نہ عوام میں نہ خواص میں! وہ ہم میں کسی سے علم میں کم نہ تھے، عمل میں

سب سے ممتاز تھے، وہ ان علوم کے عالم کے علوم باعمل تھے، جن سے ہم میں بہت کم لوگ آشنا ہیں اور جن پر عمل کرنے والا شائد کوئی نہیں، یعنی دین اور اخلاق کا علم! کبھی کبھی کچھ اس طرح کا بھی احساس ہونے لگتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں علی گڑھ بالکل ایک نئے تجربے یعنی "مرد مومن" سے دوچار ہوا ہو!

نواب محمد اسمٰعیل خان

نواب محمد اسمٰعیل خان، نواب محمد اسحٰق خاں کے بیٹے اور نواب مصطفےٰ خاں کے پوتے تھے۔ شیفتہؔ کو دیکھا نہیں، لیکن ان کی غیر معمولی ذہنی اور اخلاقی خوبیوں کا حال کتابوں میں پڑھا ہے، شیفتہؔ کی بڑائی میں کیا شک جب حالؔی اس پر گواہی دیتے ہوں!

نواب اسحٰق خاں یوپی میں سشن جج تھے، ان کے ہم عصر نواب محمد علی بھی، دونوں کے بارے میں مشہور تھا کہ انگریزوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، اس زمانے کے انگریزوں کو! انگریز حکام کا کتنا ہی دباؤ کیوں نہ پڑے، فیصلے بے لاگ دیتے تھے، مسلمان نوکری پیشہ طبقہ میں ان کے نام فخر و مسرت سے لئے جاتے تھے، جیسے یہ ان کے ہیرو ہوں!

کہنے کو تو کہا جا سکتا ہے کہ دونوں انگریزی سرکاری ملازمت میں تھے لیکن انصاف سے دیکھا جائے تو ان کا درجہ ان لوگوں میں بہتوں سے کم نہ تھا، جو اس زمانہ میں لیڈر کہلاتے تھے، بلکہ بعض اعتبار سے ان کی دلیری کا زیادہ قائل ہونا پڑتا ہے، اس لئے کہ حکومت کی ملازمت میں ہوتے

ہوئے ایمان وانصاف کے معاملے میں حکومت کے عتاب کی پروا نہیں کرتے تھے، پنشن پاکر دونوں نے ایم اے او کالج کا انتظام سنبھالا اور اسی خدمت کے دوران میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

نواب وقار الملک کے بعد نواب محمد اسحٰق خاں آنریری سیکرٹری ہوئے۔ ان کے عہد کے چند واقعات آج تک یاد آتے ہیں، ایک کلیاتِ خسرو کی تدوین اور طباعت، دوسرا نظام آصف جاہ سادس کا علی گڑھ میں ورود، تیسرے کالج کے یورپین اسٹاف کا متحد ہو کر استعفیٰ دینا اور اُس کا منظور کر لیا جانا، نواب صاحب ہی کی سیکرٹری شپ کے زمانے میں مسز سروجنی نیڈو علی گڑھ تشریف لائیں، اور اسٹریچی ہال میں وہ مشہور تقریر کی اور ان کے خیر مقدم میں مولانا سہیل نے وہ نظم پڑھی جو اب تک ہمارے دلوں میں تازہ ہے!

دہلی کے مشہور داستان گو میر باقر علی کو فن کا کمال دکھانے کے لئے پہلے پہل علی گڑھ میں نواب صاحب ہی نے دعوت دی تھی، پکّی بارک کے صحن میں رات کو محفل سجائی گئی تھی، عزّت اور محبّت کے الفاظ میں نواب صاحب نے باقر علی کا تعارف کرایا تھا، جس کا آخری فقرہ اب تک یاد ہے" میر باقر علی آج داستان سنائیں گے، کل وہ خود داستان بن جائیں گے!" باقر علی تھے کہ نواب صاحب کے ہر فقرے پر بچھے جا رہے تھے، اور طلبا کا انداز پذیرائی دیکھ کر جیسے پھولے نہ سماتے تھے،

داستان شروع کی تو یہ عالم تھا کہ کبھی اس طرح محفل سنّاٹے میں آجاتی جیسے دُور دُور کوئی متنفس موجود نہ ہو اور کبھی تحسین وآفرین کے نعروں کا یہ عالم ہوتا کہ دور دور تک کے لوگ چونک پڑتے، کیسے شریف شائستہ، صحیح المذاق، زندگی کی صحت مند توانائیوں سے لبریز اور تہذیبی روایات

سے آراستہ نوجوان طلبہ کا اجتماع تھا، پھر پکّی بارک کی وہ فضا جس میں خود کتنی داستانیں کس کس روپ میں کہاں کہاں خوابیدہ یا بیدار تھیں!

داستان گوئی یوں تو ایک معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن اس رات میر باقر علی کی داستان گوئی کا کمال دیکھ کر یقین آگیا کہ افسانہ طرازی اور افسانہ طراز کیا ہوتے ہیں اور کیا کر سکتے ہیں، ایسے فنکار کو آپ کیا کہیں گے جو ماضی کو مستقبل کے لئے ہمیشہ زندہ رکھ سکے!

معاف کیجئے گا ماضی کی یاد نے ماضی سے بھی دُور کہیں پھینک دیا۔ ماضی کو میں اپنا کارنامہ نہیں قرار دیتا، یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ قرار دیں البتّہ اتنی بات ضرور ہے کہ اپنے آپ کو کبھی کبھی ماضی کا کارنامہ سمجھنے لگتا ہوں! کہنا یہ تھا کہ نواب اسحٰق خاں ہم لوگوں کو لطف اندوز ہوتے دیکھ کر خود بڑے خوش ہوتے تھے، رہ رہ کر قہقہے لگاتے۔ بوڑھے داستان گو کی پیٹھ ٹھپکتے، باقر علی فرطِ مسرّت وافتخار سے کھڑے ہو ہو کر تعظیم بجالاتے اور عالمِ کیف وجذب میں پہنچ کر اس طرح داستان سُنانے لگتے جیسے آج کی رات آخری تاریخ تھی، اس کے بعد نہ یہ فن رہے گا، نہ فن کار، نہ اس کے قدرداں!

نواب محمد اسحٰق خاں کے خوش ہونے اور قہقہے لگانے کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا گیا کہ نواب اسمٰعیل خاں بھی اپنی خوشی اور خوشنودی کا اظہار اسی طرح کرتے تھے، یہ بات نواب صاحب کے مخلص اور معتبر ہونے کی ایک واضح علامت تھی، ان سے مل کر آپ اس تذبذب میں نہیں مبتلا ہو سکتے تھے کہ اُنھوں نے آپ کا اعتبار کیا یا نہیں، جو بات ان کے دل میں ہوتی وہی زبان پر آتی، اس سے ہم سب کو اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں نہ صرف سہولت ہوتی بلکہ لطف آتا اور حوصلہ بڑھتا۔

نواب صاحب ہم سب پر بڑے مہربان تھے، اور ہم پر بھروسہ کرتے تھے، دلیر اور حوصلہ مند تھے، کوئی نازک موقع آن پڑتا اور بات یونیورسٹی سے باہر پہنچنے والی ہوتی تو وہ ہماری فروگذاشت کو اپنی فروگذاشت بنا لیتے اور ہم پر کسی طرح آنچ نہ آنے دیتے، ہماری عزت کو اپنی عزت سمجھنے والے تو بہت سے مل جاتے ہیں، گو میرا ساتھ ایسوں سے بھی پڑا ہے جو ہماری عزت کو اپنی توہین سمجھتے تھے، نواب صاحب ہماری ذلت کو بھی اپنی ذلت سمجھتے تھے! قبیلے کا سردار ہونے کی ان میں بڑی نشانیاں ملتی تھیں۔

نواب صاحب عرصے تک یونیورسٹی کے ٹریژرر رہ چکے تھے، ملک تقسیم ہوا، تو مستقل وائس چانسلر ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا جب اطرافِ ملک میں مسلمانوں کی آبرو، جان اور مال کی تباہی و تاراجی کا وہ عالم تھا کہ اتنے دن گزر جانے کے بعد آج بھی ان کے تصوّر سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، یہ قوم بھی جسے مسلمان کہتے کبھی کبھی شرم آنے لگتی ہے۔ کیسی کیسی ہولناکیوں سے جانبر ہو چکی ہے، لیکن اب تاریخی کارناموں کے بجائے تاریخی رسوائیوں کی خوگر ہونے لگی ہے، قرآن پاک میں اس موقع کے لئے غالباً کوئی وعید آئی ہے جو یاد نہیں آتی ورنہ ضرور لکھ دیتا۔

نواب صاحب جس ذہنی اور روحانی کرب میں مبتلا تھے، اس کا اندازہ کرنا ان لوگوں کے لئے مشکل ہے، جو نہ ان کے قریب تھے نہ صورتِ حال سے براہِ راست واقف، ہر وقت اس کا خطرہ رہتا کہ کہیں یونیورسٹی کا وہی حشر نہ ہو جو دوسری مسلمان بستیوں کا ہو چکا تھا، ہر طرف سے وحشت ناک خبریں آرہی تھیں، غارت گروں کا جتھا علی گڑھ کے آس پاس منڈلا رہا تھا۔ نواب صاحب جس لیگ کے ارکانِ اعلیٰ میں سے تھے...... اس کی لائی

ہوئی تباہیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور کچھ کر نہیں پاتے تھے، اس پر مستزاد یہ کہ مسلمانوں کی متاعِ گراں بہا مسلم یونیورسٹی کو بچانے کی ذمہ داری ان کے سر تھی، مقامی حکام سے بروقت امداد کی توقع موہوم تھی، وہ جو انگریزی میں ایک مثل مشہور ہے کہ فلاں شخص غم یا غیرت کا ایسا شکار ہوا کہ پھر تمام عمر نہیں مسکرایا، کم و بیش یہی کیفیت نواب صاحب کی تھی۔

یہاں پہنچ کر قائل ہونا پڑتا ہے کہ آخر کار منصب نہیں بلکہ شخصیت فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے، ملک تقسیم ہوا ہے تو کانگرس اور مسلم لیگ کی عداوت انتہا کو پہنچ چکی تھی، لیکن کانگرس کے ہر طبقے میں نواب صاحب کی ساکھ قائم رہی، جس کا ثبوت راج گوپال اچاریہ بالقابہ گورنر جنرل ہند کی وہ تقریر ہے جو انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے اسی سال کے کنووکیشن میں کی تھی اور نواب صاحب کی خدمات اور خوبیوں کا برملا اعتراف کیا تھا، کانگرس حکومت کے اتنے ذمہ دار اور مقتدر شخص کا مسلم لیگ کے اتنے ممتاز رُکن کو اس زمانے میں علی گڑھ آ کر سراہنا معمولی بات نہ تھی!

مسز سروجنی نیڈو یوپی کی گورنر تھیں، علی گڑھ تشریف لائیں، ممدوحہ کے اعزاز میں نواب صاحب نے یونیورسٹی کے کچھ لوگوں کو شب میں اپنے ہاں شعر و سخن کی ایک مختصر اور منتخب محفل میں مدعو کر لیا تھا، موصوفہ جہاں موجود ہوں وہاں کی گرمیٔ محفل کا کیا کہنا! اس موقع پر اپنے خلوص اور خوش گفتاری سے ایسا کام لیا اور حاضرین میں سے ہر ایک کی فرداً فرداً ایسی دل نوازی کی کہ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے فضا ہی بدل گئی ہو۔ نواب صاحب کو اپنی اور اپنی حکومت کی طرف سے یونیورسٹی کی حفاظت اور حرمت کا اطمینان دلایا، اس زمانے میں حکومت کا شاید ہی کوئی اتنا بڑا آدمی باستثنا چند علی گڑھ

کی تالیفِ قلب میں اس جرأت اور مرحمت کا نمونہ پیش کرنے کی ہمت کرسکتا تھا!۔

سوچتا ہوں مسز نیڈو ۱۹۱۶ء میں نواب محمد اسحٰق خاں کی آنریری سیکرٹری شپ میں ان کی دعوت پر علی گڑھ تشریف لائیں اور اپنی بے مثل خطابت سے بقول سہیل مرحوم ؎

شکست رنگ ساحری چو زونوائے شاعری
نمود سحر سامری اگر در خطاب زد!

کا کیسا سماں پیدا کردیا تھا۔ پھر تیس بتیس سال گزر جاتے ہیں۔ نواب اسحٰق خاں کے فرزند علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوتے ہیں، ملک میں تقسیم کا تہلکہ مچا ہوا ہے، مسلمان خاک و خون میں ملائے جانے لگے ہیں۔ علی گڑھ نرغے میں آجاتا ہے تو وہی مسز نیڈو کسی کے بلائے بغیر علی گڑھ پہنچتی ہیں اور اپنی شرافت اور مرحمت سے نواب صاحب اور ہم سب کو ڈھارس دیتی ہیں اور اس ادارے کو تاراج ہونے سے بچانے میں گرانقدر حصّہ لیتی ہیں۔ آج بھی جبکہ صورتِ حال بہت کچھ بدل چکی ہے مسز نیڈو اور اس صوبے میں ان کی گورنری اکثر بے اختیار یاد آتی ہے اور محزوں بنا جاتی ہے، قانون کہتا ہے، گورنر کیا کرسکتا ہے، قانون کا یہ کہنا سچ ہے' اس لئے کہ اپنے بارے میں کچھ کہنے والا اس سے زیادہ مستند اور کون ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ بھی تو ہے کہ قانون بنانے والوں اور خود قانون کو یہ نہ معلوم ہو کہ شخصیت کیا کرسکتی ہے۔

یادوں کے سلسلے میں باتیں بھی کہاں کہاں پہنچیں! نواب صاحب کو سب سے پہلے غالباً ۱۹۲۰ء میں ان کے دولت کدہ مصطفیٰ کاسل میرٹھ میں دیکھا تھا، اس زمانے میں میرٹھ میں ایک پراونشل ٹینس ٹورنامنٹ ہوتا تھا

جس میں شرکت کرنے کے لئے کالج سے ٹیم گئی تھی، اور نواب صاحب کی مہمان ہوئی تھی، ان ہی دنوں مسعود ٹامی[1] مرحوم میرٹھ میں غالباً نائب تحصیلدار تھے، مسعود ٹامی کو خبر لگ جائے کہ علی گڑھ سے طلبہ آئے ہوئے ہیں تو ملنے کے لئے فرطِ محبت سے بے قرار ہو جاتے تھے، موٹر لے کر مصطفیٰ کاسل پہنچے اور نواب صاحب سے کہا، کلکٹر صاحب سے آج کی چھٹی لے لی ہے، آپ بھی ان لڑکوں کو چھٹی دے دیجئے، سب کو پکنک پر سَردھنے کا گرجا دکھانے لے جاؤں گا، کھانا ساتھ ہے، لنچ اور سہ پہر کی چائے وہیں ہو گی، شام تک سب کو واپس پہنچا جاؤں گا، نواب صاحب نے فرمایا، لے جاؤ، خاطر مدارات خوب کرنا، صرف اپنی عادتیں نہ سکھانا، یہ کہہ کر ایک قہقہہ لگایا ٹامی مرحوم بھی ہنس پڑے اور بولے، نواب صاحب کاش عادت سکھا دینا ہی آسان ہوتا،

---

[1] مسعود ٹامی کی بذلہ سنجی، شوخی اور تفریحی شرارتوں کے قصے اس زمانہ میں ہر علی گڑھ والے کی زبان پر تھے، ایک دن یونین کا جلسہ تھا، اچھے اچھے مقرر موجود تھے، مسعود ٹامی بھی کہیں سے آنکلے، حاضرین نے بے اختیار نعرہ لگایا کہ مسعود ٹامی بھی تقریر کریں، وائس پریسیڈنٹ (اب پریسیڈنٹ) نے کہا مسعود صاحب سب سے آخر میں تقریر فرمائیں گے تاکہ وہ دوسری تمام تقریروں پر تبصرہ فرما سکیں، وقت آنے پر مسعود صاحب ڈائس پر تشریف لائے اور "ڈمب شو" شروع کر دیا، یعنی ہر مقرر کے سراپا، اس کی تقریر اور اندازِ تقریر کو زبان سے نہیں بلکہ اعضاء و جوارح کی حرکات و سکنات سے دکھانا بتانا شروع کیا، جیسے اسکرین پر خاموش تصاویر دکھائی جاتی ہیں، گانے اور ناچنے کے فن کے ماہر آواز اور حرکت سے مختلف کیفیات کا اظہار شاید اس خوبی سے نہ کر پائیں جیسی مسعود ٹامی نے اس موقع پر تقریر کرنے والوں کی خاموش نقل ہم کو دکھائی تھی، حاضرین کس طرح سے لطف اندوز ہوئے ہوں گے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جتنا آپ کو اندیشہ ہے! پھر دونوں نے قہقہے لگائے اور ہم سب مسعود ٹامی کے قبضے میں چلے گئے۔

اب کیا بتاؤں اور کیونکر بتاؤں کہ مسعود ٹامی ہم سب کو لے کر چلے ہیں تو ان کی سرخوشی کا کیا عالم تھا، جیسے زندگی کی کوئی بہت بڑی آرزو دفعتہً پوری ہو گئی ہو! علی گڑھ اور علی گڑھ کے طلبہ پر مسعود ٹامی کی حد تک فریفتہ میں نے کسی اور کو اب تک نہ پایا، ہر اعتبار سے کتنا حسین مردانہ پیکر، سُرخ سپید رنگت، بالکل جیسی اس زمانے میں انور پاشا کی روغنی تصویر جا بجا آویزاں ملتی تھی، ہر وقت خوش رہنا اور ساتھیوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا کیسا ذہین اور محبت کرنے والا شخص، بار بار علی گڑھ کا ذکر اور ہم پر نوازشہائے پیدا و پنہاں!"

آج کے مصطفےٰ کاسل کو دیکھ کر چالیس برس یا اس سے بھی پہلے کے مصطفیٰ کاسل کا اندازہ لگانا مشکل ہے، کتنی خوبصورت شاندار عمارت، وسیع باغ اور گھنیرے تناور درخت جو کبھی کبھی اتنے درخت نہیں معلوم ہوتے تھے، جتنے پرانے زمانے کے سورما اور ان کی داستانہائے رزم و بزم! ایسے دیو پیکر درخت اتنی تعداد میں اس قرینے سے یکجا وسط شہر میں مَیں نے اس سے پہلے نہیں دیکھے تھے۔ عمارات کے وسط میں ایک مختصر سا عجائب خانہ تھا جس میں طرح طرح کے نوادر قرینے سے سجائے گئے تھے، ایک چیز اب تک یاد ہے، ہاتھی دانت میں ایک نسوانی پیکر تراشا گیا تھا جس کی اونچائی غالباً ۸، ۱۰ انچ ہوگی، اس وقت اس کو دیکھ کر کچھ اس طرح کا خیال گزرا تھا کہ عورت کشش کی جتنی باتیں فطرت نے ودیعت کی تھیں، یا ابتدا سے آج تک اچھے اور بڑے شعراء نے دریافت کی تھیں، ان کے بعد بھی کچھ باقی رہ

گیا تھا جس کو مجسمہ ساز نے پورا کر دیا تھا!

مدّتوں بعد، یاد نہیں آتا کس سلسلے میں ایک دفعہ پھر مصطفےٰ کاسل جانا ہوا، نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ عمارات، باغ اور درخت سب کہنگی، ویرانی اور اور افسردگی کی زد میں تھے، سوا نواب صاحب کی شفقت اور شگفتگی کے جو زمانے کی لائی ہوئی کسی زبونی اور ابتری سے متاثر نہ تھی، آج دفعتہً سُننے میں آیا کہ نواب صاحب رحلت فرما گئے! مصطفےٰ کاسل ڈھے گیا جس میں کتنی اور کیسی کیسی یادیں دفن ہو گئیں، محبت و مروّت کی یادیں، مہمان نوازی اور وضعداری کی یادیں۔ غیرت و حمیت کی یادیں، شرافت اور شفقت کی یادیں! ایک شخص کے زندہ رہنے سے کتنی اقدار اور روایات کو فروغ تھا، اس کے اُٹھ جانے سے کتنی شمعیں بے نور اور محفلیں سونی ہو گئیں!

کہاں ہے آج تو اے آفتابِ نیم شبی

تقسیمِ ملک سے پہلے کی تقریباً تیس بتیس سال کی قومی سرگرمیوں میں نواب صاحب کی خدمات کا مسلسل اور معتدبہ حصّہ رہا ہے، خلافت کی تحریک میں پیش پیش تھے، مسلم لیگ کے اعیان و اکابرین سے تھے، مسلم یونیورسٹی کے ٹریزرر اور وائس چانسلر رہے، کوئی غیر معمولی سیاست داں، ماہرِ تعلیم، عالم فاضل، یا کسی فن میں یگانۂ روزگار نہ تھے، لیکن ایسی شخصیت کے مالک تھے، جس کے بغیر تمام سرگرمیاں نامکمّل اور ناقابلِ اعتبار ٹھہرتی ہیں!

مسلم لیگ کے آزمودہ کار اور مقتدر رُکن ہونے کے باوجود مسلم لیگ میں اتنے قابلِ اعتنا نہیں سمجھے گئے۔ جتنے کہ وہ مستحق تھے۔ سبب یہ تھا کہ سیاست میں شخص کو نہیں مصلحت کو دیکھتے ہیں، لیگ کی مصلحت اور طریقۂ کار سے بحیثیتِ مجموعی نواب صاحب کی سیرت و شخصیّت ہم آہنگ نہ ہو سکی۔ نواب صاحب

نے اپنے لئے ایک سطح مقرّر کرلی تھی۔ جس سے وہ کسی حال میں نیچے اُترنا گوارا نہیں کرسکتے تھے، ان کی زندگی میں اکثر ایسے مواقع آئے جہاں اپنے اس اصول، مزاج یا طریقۂ کار کی خاطر ان کو نقصان اُٹھانا پڑا اور حریفوں نے اس سے فائدہ اُٹھایا۔ لیکن نواب صاحب اس طرح کی شکست کو اپنی فتح سمجھتے تھے۔ اِس لئے بددِل اور بیزار ہونے کے بجائے ہمیشہ شگفتہ اور شادماں رہے، نواب صاحب پارٹی نہیں بنا سکتے تھے، اور پارٹی بنائے بغیر پبلک لائف کے نشیب و فراز سے عزّت اور عافیت سے گزرنا تقریباً ناممکن ہے۔

جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے، نواب صاحب مدّتوں علی گڑھ سے وابستہ رہے اور بڑے ذمہ دار عہدوں پر فائز، اس میں شک نہیں اس زمانے میں (تقسیمِ ملک سے پہلے) مسلم یونیورسٹی کا کاروبار اتنا پھیلا ہوا نہ تھا، اور نت نئے مسائل کا اتنا سامنا نہ تھا، جتنا آج ہے، پھر بھی انتظامی دشواریاں کچھ کم نہ تھیں، یونیورسٹی کی آمدنی بہت کم تھی، ایک ترقی پذیر معیاری ادارے کے لئے مالی دشواری بہت بڑی مصیبت ہے، اسٹاف کی کمی، سامان کی کمی، عمارت کی کمی، گرانی کے سبب سے ملازموں کی تنخواہوں میں اضافے کی ضرورت، اس قسم کے کتنے اور مسائل تھے، جن کا یونیورسٹی کو سامنا تھا، بااین ہمہ نواب صاحب کی شرافت، بے لوثی اور حُسنِ سلوک کا ایسا اثر نہ تھا کہ کسی دشواری نے پیچیدگی ناگواری کی صورت کبھی نہیں اختیار کی، ادنیٰ ملازمین سے لے کر اعلیٰ عہدیداروں تک سبھی تو نواب صاحب پر بھروسہ کرتے تھے، اور خود نواب صاحب سے عزّت اور محبت سے پیش آتے تھے، کسی کے پاس حاجت لے کر جائیے تو نفس کو بالعموم غیرت کا احساس ہوتا ہے لیکن نواب صاحب اس وقار سے ملتے تھے، اور دل سوزی سے پرسشِ احوال کرتے اور مدد پر

آمادہ ہو جاتے تھے کہ ذلت کے بجائے آدمی اپنے آپ کو گرامی محسوس کرنے لگتا تھا، نواب صاحب اتنے اچھے تھے کہ کوئی بُرا شخص بھی اپنے آپ کو آسانی سے اس پر راضی نہیں کر سکتا تھا، کہ ان کی بُرائی پر آمادہ ہو جائے۔

ایک دن نواب صاحب کلکٹر کے ہاں لنچ پر مدعو تھے، شاید کسی منسٹر کے اعزاز میں یہ تقریب تھی، اس زمانے میں شاید یونیورسٹی کی اپنی کوئی کار نہ تھی، معلوم نہیں کہاں سے ایک خستہ و خوار جیپ آئی، وقت تنگ تھا، نواب صاحب عجلت میں تھے، کوٹھی سے نکلے ہی تھے کہ ایک صاحب آتے ہوئے نظر آئے، موٹر روک دی، معلوم ہوا کہ عارضی ملازم تھے، تنخواہ کے روپے ملنے میں کوئی پیچیدگی پڑ گئی تھی، اور آفس والوں نے ان کو چکر میں ڈال رکھا تھا، نواب صاحب نے ان کو گاڑی میں ساتھ بٹھا لیا، وکٹوریہ گیٹ پر لائے اور کہا کہ اوپر جا کر متعلقہ کلرک کو بلا لائیے، وہ آئے تو وہیں آرڈر لکھ دیا اور فرمایا ٹریژرر صاحب سے میرا سلام کہنا اور چیک پر دستخط کرا کے ان صاحب کے حوالے کر دینا! اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا، لنچ سے واپسی پر پھر گیٹ پر آئے اور دریافت کرایا کہ چیک دے دیا گیا یا نہیں؟ اطمینان ہو گیا تو کوٹھی پر واپس آئے۔

نواب صاحب نے اپنے ٹریژررشپ کے عہد میں یہ اسکیم پیش کی تھی کہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور عمال کو یونیورسٹی کے حدود میں ذاتی مکان بنا کر مستقلاً آباد ہو جانے کے لئے قطعاتِ زمین دے جائیں اور مناسب سہولتیں فراہم کی جائیں، مقصد یہ تھا کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے پر بھی اساتذہ کا بالواسطہ تعلق اس ادارہ سے رہ سکے، ان کی ہمہ وقت موجودگی سے طلبہ کو ہر طرح کا فائدہ پہنچے گا، اور یونیورسٹی میں ایسی فضا پیدا ہو جائے گی جو یہاں

کی علمی، تعلیمی اور تہذیبی روایات کو صحت مند اور تازہ کار رکھے گی۔ ہندوستان کی اقامتی درس گاہوں میں مسلم یونیورسٹی کا یہ اقدام اپنی نظیر آپ تھا خیال کیا جاتا تھا کہ اس منصوبے کے بروئے کار آنے پر اس درسگاہ کی دیرینہ اقامتی حیثیت کو اور زیادہ فروغ نصیب ہو گا، یونیورسٹی نے اس اسکیم کو منظور کر لیا، چنانچہ مقررہ شرائط پر کافی لوگوں نے بڑے شوق اور حوصلے سے قطعاتِ زمین لئے اور مکان بنوائے، پھر معلوم نہیں کیا صورت پیش آئی کہ کچھ دنوں بعد اس اسکیم کو ختم کر دیا گیا۔ ۱۹۴۷ء کے رستاخیز میں وہ لوگ بھی اِدھر اُدھر ہو گئے جنہوں نے مکان بنوا لئے تھے، چنانچہ اس اسکیم سے جو فوائد مرتب ہونے والے تھے وہ نہ ہو سکے۔

اس زمانے میں اسٹاف کے لوگ یونیورسٹی کے اس اقدام پر بہت جوش ہوئے تھے، اور اس کا عام چرچا تھا کہ نواب صاحب کو ادارے کے اساتذہ اور عمال کا کتنا خیال تھا۔ ان کے لئے ان کے قلب میں کتنی وسعت تھی، اور جہاں تک یونیورسٹی کی فلاح و بہبود کا تعلق تھا، ان کی نظر کتنی دور رس تھی۔

نواب صاحب بڑے سیر چشم تھے، ان کا دستر خوان بڑا وسیع تھا، اپنے مہمانوں کے ساتھ کھانے پر بیٹھے ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے مہمانوں کی موجودگی شرف اور شادمانی کی کوئی تقریب تھی، کھانے انواع و اقسام کے ہوتے، کھانے والے بھی ہر طرح کے ہوتے، یہ نہیں کہ ہر روز معزز مہمانوں کا مجمع ہوتا، ہر روز تو معزز مہمان کسی کے ہاں نہیں ہوتے، نواب صاحب کے ہاں دستور یہ تھا کہ خود ان کے یا سرکاری جتنے ملازم یا کام کرنے والے ہوتے اور آس پاس ان کے بیوی بچے ہوتے تو وہ سبھی نواب صاحب کے مطبخ سے کھانا کھاتے، یہی نہیں بلکہ کھانے، ناشتے کا وقت ہوا اور کوئی کلرک یا چپراسی پہنچ گیا جو نواب صاحب کے کلرک یا چپراسی کا شناسا

ہوا تو وہ بھی کھانے میں شریک ہوگیا۔ اس طور پر نواب صاحب ہی نہیں ان کے ملازمین اور متوسلین کا دسترخوان بھی کچھ کم وسیع نہ ہوتا۔ صورتِ حال کچھ اس طرح کی تھی کہ نواب صاحب کی میزبانی تو "شرح معین" تھی، ملازمین اور متوسلین کی حیثیت "شکمی میزبان" کی ہوتی!

یہ وصف ان کا خاندانی تھا، اور جاگیرداری یا سرمایہ داری سے وابستہ نہ تھا جس نے وفا نہ کی، مہمان نوازی اور وضعداری کے اوصاف نے نواب صاحب کا ساتھ مرتے دم تک دیا' ان اوصاف کا نباہنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں" نواب صاحب سے شروع سے آخر تک مالی دشواریوں میں مبتلا رہے' جوں جوں دن گزرتے گئے' یہ دشواریاں بڑھتی گئیں، آخر میں تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ کسی وقت بھی پانی سر سے اونچا ہو سکتا تھا لیکن حیرت اس پر ہے کہ نواب صاحب کی کسی بات سے کبھی یہ ظاہر نہیں ہوا کہ ان پر کیا گزر رہی ہے، تنگ حال ہونا اور اس کا اظہار نہ ہونے دینا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اقتدار کو پہنچنا اور آپے میں رہنا۔!

نواب صاحب بڑے اونچے درجے کے ارسٹوکریٹ تھے، جس کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ کیسی ہی تکلیف یا پریشانی میں کیوں نہ مبتلا ہو اس کا اظہار اس کی کسی بات سے نہ ہو، ہمارے ہاں ادنیٰ درجے کی بھی ارسٹوکریسی ملتی ہے، لیکن جس بات کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ یونان کے عہدِ اولیں کی ارسٹوکریسی (اشرافیت) ہے جو وہاں کے دیوتاؤں کا درجہ اختیار کر چکی تھی۔

مہمانوں کی تواضع و تکریم' اولاد کی تعلیم و تربیت، گھریلو زندگی کو خوبصورتی اور خیر و برکت سے مالا مال رکھنے میں نواب صاحب کی بیگم صاحبہ کو بڑا دخل تھا۔ پردہ نشین، باوقار، خدا ترس، خوش مزاج' اور بڑی نفاست پسند بی بی

تھیں، یونیورسٹی میں غریب عورتوں کا سہارا تھیں، آج تک یہاں کے نچلے طبقے کے ملازمین، ان کے بیوی بچے بیگم صاحبہ کی دلنوازی اور داد و دہش کا ذکر بڑی محبت اور حسرت سے کرتے ہیں، موقع آئے تو ان میں کسی نہ کسی کو یہ ضرور کہتے سنیں گے کہ کھانے پینے اور عزت و آرام کے مزے تو نواب اسمٰعیل خاں صاحب کی بیگم صاحبہ کے زمانے میں اُٹھائے! کہنے کو تو کہا جاتا ہے کہ اولاد کی تقدیر بنانے میں والدین کو بڑا دخل ہوتا ہے، گو اب یہ بھی کہا جانے لگا ہے کہ والدین کی تقدیر بگاڑنے میں اولاد کا دخل کچھ کم نہیں ہوتا! لیکن جہاں تک نواب صاحب کی اولاد کا تعلق ہے، یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اس وقت ان کی زندگی میں جو ہمہ جہت شہرت اور وقعت نصیب ہے، اس میں نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کے فیض تربیت اور خاندان کی اعلیٰ روایات کا بڑا حصہ ہے!

نواب صاحب مجھ پر کتنا کرم فرماتے تھے، اور میرے بچوں اور عزیزوں سے کس محبت اور عزت سے پیش آتے تھے، جی چاہتا ہے اس کا تذکرہ تفصیل سے کروں، اس سے نواب صاحب کی شفقت، حق پسندی اور وضعداری کی کیسی قابلِ قدر مثالیں سامنے آسکتی ہیں، لیکن کرتا ہوں تو اس کا احساس ہوتا ہے کہ اس میں خودستائی اور خودنمائی کا بھی پہلو نکلتا ہے، جو ممکن ہے کسی اور موقع پر گوارا کر لیتا، یہاں اس کی کسی طرح ہمت نہیں ہوتی، اور نہ کروں تو غیرت دامن گیر ہوتی ہے کہ وہ حق نہیں ادا کر رہا ہوں جو نواب صاحب کا مجھ پر ہے!

نواب صاحب کی فردِ اعمال تو خدا کے علم میں ہے، اور نجات اُخروی کا سر رشتہ بھی اسی کے ہاتھ میں ہے، لیکن نواب صاحب کی محبت و منزلت

سے میرا دل جس قدر معمور ہے اس سے امید کرتا ہوں کہ مرحوم کو خدا اپنی بے پایاں بخششوں سے ضرور نوازے گا، میرا کچھ اس طرح کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنی بخشش کی بشارت اس محبّت سے بھی دیتا ہے جو وہ اپنے نیک بندوں کی طرف سے اپنے بعض گنہگار بندوں کے دل میں ڈال دیتا ہے!

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا مرحوم سے خط وکتابت عمر بھر میں دو بار ہوئی۔ ملاقات صرف ایک بار، وہ بھی ان کے آفس میں چند منٹ کے لئے ڈیوٹی سوسائٹی سے متعلق، غالباً ۱۹۴۸ء کے آخر میں! اس طرح میں ان لوگوں میں ہوں جو مرحوم کے بارے میں براہِ راست بہت کم واقفیت رکھتے ہیں، مرحوم کی نجی، قومی یا علمی زندگی سے اسی حد تک متعارف ہوں جس حد تک کتب، رسائل، تقاریر اور مختلف اشخاص کی مدد سے مجھ جیسی محدود فکر و فہم کا آدمی مولانا جیسی عظیم شخصیت سے ہو سکتا ہے!

بہت سے دوسرے اصحاب کے مانند مولانا سے میری غائبانہ اور بہت گہری عقیدت اس وقت سے ہے جب بلقان اور طرابلس کی جنگ برپا تھی، الہلال میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے، اور میں اسکول کا طالب علم تھا۔ کیسے اچھے وہ دن تھے جب جینے کی ہر خوشی اپنے دیار اور اپنے عزیزوں اور دوستوں میں نصیب تھی اور اس سے کم خوشی مجاہدوں کے دیار میں جان دینے کی اس کی دعوت و بشارت میں نہیں ہوتی تھی جو مولانا

کی آتش نوائی میں ملتی تھی۔

عمر کا وہ دور کتنا مسعود اور کتنا عجیب تھا، جب اچھے اور بُرے کاموں کے لئے جیتے رہنے اور جان دینے دونوں کی یکساں خوشی ہوتی تھی۔ گذرے ہوئے دنوں کی یاد کس کو نہیں عزیز ہوتی، بالخصوص بوڑھوں کو جنہیں صرف ماضی کی جائے پناہ میسّر ہوتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ وہ عہد کتنا مسعود اور کتنا عجیب تھا، واقعہ کے اعتبار سے ممکن ہے اتنا صحیح نہ ہو جتنا اپنی یاد کے اعتبار سے میرے لئے حسین و غمیں ہے! بہر حال وہ زمانہ کب کا ختم ہوا اور زمانہ بھی کیا کرے اس کی تقدیر ہی یہ ہے، آج مولانا آزاد بھی اس جہان سے اُٹھ گئے کس کو یاد کر کے کس کا ماتم کروں!

مولانا ان برگزیدہ ہستیوں میں تھے جو اپنے عہد سے بڑی تھیں۔ وہ آفریندۂ عہد تھے، اس لئے ان کی کشمکش ایسے لوگوں سے رہتی جو زائیدۂ عہد ہوتے، وہ ہماری تاریخ، ہماری تہذیب اور ہمارے علوم کا اعتبار و افتخار تھے، اس کا احساس آج ہو رہا ہے جب وہ ہم میں نہیں رہے، کیا کیا جائے ایسا احساس بھی ایسے ہی وقت ہوتا ہے۔

سیاسی پلیٹ فارم پر مولانا کے آنے کا وہی زمانہ تھا، جب مسلم یونیورسٹی کی تحریک ملک میں پھیل چکی تھی اور ہز ہائینس آغا خان اور مولانا محمد علی اور شوکت علی بھی ہمارے ویسے ہی ہیرو بنے ہوئے تھے جیسے بلقان اور طرابلس کے جانباز مجاہد! اس سے پہلے مسلم لیگ قائم ہو چکی تھی اور تقسیم بنگال اور اس کی تنسیخ کا عمل اور ردّ عمل بھی سامنے آچکا تھا۔ برطانوی تسلّط سے نجات حاصل کرنے کے لئے مولانا آزاد نے ہندوستانی قومیت کے متحدہ محاذ کا انتخاب کیا۔ اصولاً وہ علی گڑھ یونیورسٹی کی تحریک اور مسلم لیگ کے پروگرام کی تائید

میں نہ تھے، وہ ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف نہیں بلکہ دونوں کو انگریزوں کے خلاف صف آرا ہونے کی دعوت دیتے تھے۔ اس عقیدے کی حمایت میں ان پر کیسے کیسے حادثات نہیں گزر گئے، دو چار مہینے یا سال نہیں کم و بیش نصف صدی تک گزرتے رہے!

قطع نظر اس سے کہ مولانا نے اپنی غیر معمولی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے کس محاذِ جنگ کا انتخاب کیا اور اس کا نتیجہ کیا ہوا، مجھے جو چیز سب سے عجیب اور عظیم نظر آئی وہ ان کا اپنی فراست پر بھروسہ اور اپنے عقیدے کی محکمی تھی۔ کتنی مدت پہلے اُنھوں نے اسی فراست کی روشنی میں جو راستہ اختیار کیا اور جس منزل کو سامنے رکھا اس سے تمام عمر سرِمو انحراف نہیں کیا۔ اس زمانے میں تذبذب اور تفرقے کی کیسی کیسی نزاع اور نزاکتوں کا سامنا اور ان کی زد میں آکر کیسے کیسے ساتھیوں نے فکر و عمل میں کیسے کیسے ردو بدل کئے، لیکن مولانا نے اپنے اختیار کئے ہوئے راستے سے مُنہ نہ موڑا۔ سیاست کے صحیفے میں اس طریقِ عمل کو کبھی کبھی نہیں بھی سراہا گیا لیکن اس کو کیا کہئے کہ بالآخر ان تمام چھوٹے بڑے ساتھیوں اور سرداروں کو جو سیاست کے الیاس و خضر یا قیس و کوہکن سمجھے جاتے تھے، اسی راستہ پر آنا اور اسی کعبۂ مقصود کی طرف پلٹنا پڑا جو مولانا کا بتایا ہوا تھا!

مولانا کا ایک فقرہ اس وقت یاد آرہا ہے جو کہیں یا تو نظر سے گذرا ہے یا سُننے میں آیا۔ کچھ اس طرح کی بات کہی ہے کہ "تم لوگ پانی اور کیچڑ کو دیکھ کر بارش کا یقین کرتے ہو میں اس کو ہوا میں سونگھ کر جان لیتا ہوں۔" دنیا کے کم لیڈروں کو یہ درجہ نصیب ہوا ہے۔

بلقان اور طرابلس کی جنگوں کا نعرہ مولانا کی زبان اور قلم سے نکل کر

پہلی بار ہمارے کانوں میں گونجا اور دل میں اُتر گیا۔ ان کی تحریر و تقریر کی بجلیاں اور زلزلے ہندوستان میں وہی کام کر رہے تھے جو مسلمان مجاہدین یورپ اور افریقہ کے میدانِ کارزار میں اپنے لہو اور تلواروں سے انجام دے رہے تھے، یہاں تک کہ کبھی کبھی ہمارا تصوّر تاریخ کی کتنی صدیوں اور کھنڈروں کو روندتا کھوندتا اس عہد شرف و سعادت میں پہنچ جاتا جہاں شیدایانِ اسلام دادِ شجاعت و شہادت دے رہے تھے، اس زمانے میں مولانا یا ان کے اخبار الہلال کے خلاف جب کوئی تادیبی کارروائی ہوتی، اخبار سے ضمانت طلب کی جاتی یا مولانا کو نظر بند کر دیا جاتا تو ایسا ہی محسوس ہوتا جیسے مسلمانوں کا کوئی جانباز جنرل میدانِ جنگ میں اسیر ہو گیا یا کام آ گیا۔ بلقان اور طرابلس کے محاربے (حق و باطل کی جنگ) جہاں کہیں جب کہیں برپا ہوں گے مولانا کی تحریریں اور تقریریں دعوتِ دار و رسن دیتی رہیں گی!

یہ پہلا موقعہ تھا جب مولانا کی تحریروں کے طفیل مسلمانوں کو دور دراز بکھرے ہوئے مسلمانوں کی ابتلا و آزمائش میں شریک ہونے کا احساس و افتخار ہوا، گو یہاں اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے دُکھ درد میں شریک ہونے کی توفیق باہر کے مسلمانوں کو کبھی نہیں ہوئی، نہ وہاں کے زعما کو نہ عوام کو! اور یہ ہندوستانی مسلمان کا کارنامہ ہے جس کی ہندوستانی قومیت کی محکمی سے کٹر سے کٹر ہندو اور جس کے اسلامی تصوّرات، مذہبی معتقدات اور دینی خدمات سے کٹر سے کٹر مسلمان انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا، بااین ہمہ ہندوستانی قومیت کی حمایت میں جتنا ظلم و جور اپنے ملک کے مسلمانوں کے ہاتھوں مولانا ابوالکلام آزاد نے اُٹھایا، وہ ہندوستان میں شاید ہی کسی دوسرے مسلمان کے حصّہ میں آیا ہو۔

گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام کی زندگیوں میں ایک بات کتنی المناک لیکن اتنی ہی عظیم الشان نظر آتی ہے، مسلمانوں کی حمایت اور غم خواری میں اور اس وقت جب کہ مسلمانوں کے جان و مال و آبرو کی کوئی قیمت اور وقعت نہیں رہ گئی تھی، گاندھی جی اپنی ہی قوم کے ایک فرد کی گولی کا نشانہ بنے، مجھے اپنی لاعلمی پر ندامت ہوگی لیکن فرطِ افتخار سے سر اونچا ہو جائے گا، اگر کبھی یہ معلوم ہو سکا کہ گاندھی جی کی طرح کسی بڑے مسلمان کو غیر مسلموں کی حمایت میں جان سے ہاتھ دھونا پڑا! ہندوستان کی دو اتنی بڑی ہستیوں کے ساتھ ان کے ہم مذہبوں نے کیا سلوک کیا اس پر کسی اور کو نہیں ہم ہندوستانی مسلمانوں کو ضرور غور کرنا چاہیئے!

تقسیم ملک سے اب تک ہندوستان کی سیاست جن دشواریوں اور نزاکتوں سے گزری اور اب تک گزر رہی ہے اس کو تفصیل سے بیان کرنا نہ تو ضروری معلوم ہوتا ہے نہ میرے بس کی بات ہے لیکن اس دوران میں حکومتِ ہندوستان کی خارجی اور اندرونی پالیسی پر مولانا کی سیاسی بصیرت، آئینی تدبر، اخلاقی بلندی، علمی فضیلت اور شخصی وقار کس طور پر اثر انداز ہوتا رہا کسی تفصیل کا محتاج نہیں، ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور نگہداشت کے نہایت درجہ مشکل اور نازک فرائض جس خاموشی، دل سوزی اور قابلیت سے مولانا نے انجام دیئے وہ ان ہی کا حصہ تھا، مولانا کی خدمات کی اہمیت اس لئے اور بڑھ جاتی ہے کہ ان کو مسلمانوں کی حمایت اور ان کے گرتے ہوئے حوصلوں کو اونچا کرنے اور رکھنے کے فرائض ایسے حالات اور ایسے زمانے میں انجام دینے پڑے جس سے زیادہ مشکل اور نازک زمانہ مسلمانوں پر اس برصغیر میں شاید پہلے کبھی نہیں گزرا تھا۔

مولانا نے جس حد تک جن دشواریوں سے دوچار رہ کر جس کامیابی کے ساتھ ہندوستان کے تباہ حال مسلمانوں کو تسکین دینے اور تقویت پہنچانے کی خدمت انجام دی اس سے بڑی خدمت اس کو سکولر جمہوریہ کی ساکھ اندرون و بیرونِ ملک قائم کرنے میں کوئی اور نہیں انجام دے سکتا تھا، ہندوستان کی حکومت مولانا کی اس خدمت کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی، کس عظمت اور کیسی غیرت کا یہ مقام تھا کہ یہ فریضہ یکہ و تنہا اس مسلمان کے حصے میں آیا جس سے زیادہ مطعون اور مغضوب تقسیمِ ملک کی رات سے پہلے مسلمانوں کے نزدیک دوسرا مسلمان نہ تھا!

ہندوؤں یا حکومتِ ہند میں یہ غیر معمولی ساکھ مولانا نے محض حُسنِ اتفاق سے نہیں پیدا کر لی تھی، ہندو تو پھر ہمارے ہی آپ جیسے انسان ہیں ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں اور رہے ہیں جن میں مولانا کسی سے پیچھے نہیں اور بہتوں سے آگے تھے جن کا سابقہ انسانیت سے ناآشنا وحشیوں سے ہوتا تو وہ ان میں بھی اپنی سرداری مسلّم کرا لیتے! اسقاکی یا چالاکی سے نہیں برگزیدگی اور بہادری سے۔ مولانا کو صبر و صداقت کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہوگا تب کہیں جا کر یہ منزلت حاصل ہوئی ہوگی "بزیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را" کا ماجرا جو مولانا پر گزرا ہوگا، اس کا احساس ان لوگوں کو کیسے دلاؤں جو نہ اس صورتِ حال سے آشنا ہیں جن میں مولانا گرفتار تھے نہ اس کرب سے جو شاعر نے اس شعر میں بھر دیا ہے!

حکومت میں مولانا کو بعض ساتھیوں کے تعصّب اور تنگ نظری کا بھی مقابلہ کرنا پڑتا تھا اور کس غیرت مند کو نہیں کرنا پڑتا! یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب نامساعد حالات کا ہجوم تھا۔ ان پر جو گزرتی تھی اور کیا کچھ نہیں گزرتی تھی اس کو وقار اور خاموشی سے سہتے تھے، مولانا کو اپنا ہم خیال بنانے میں کبھی تامّل

نہیں ہوا لیکن اپنا غمگسار بنانا اُنھوں نے کبھی گوارا نہیں کیا۔ یہ ان کی طبیعت کا بڑا امتیاز خاصا تھا۔ وہ اپنے عزائم کے سامنے کسی دشواری کو ناقابلِ تسخیر نہیں سمجھتے تھے، دنیوی جاہ و منزلت سے بے نیاز تھے۔ کسی سے جھگڑتے نہیں تھے جھگڑنا اپنے رتبہ سے فروتر سمجھتے تھے، لیکن اس کی نوبت آجاتی تو اپنی سطح سے نیچے نہیں اُترتے تھے۔ حریف کے مقابلے میں یہ ان کی پہلی جیت ہوئی تھی۔

علم کی معرفت اور مذہب کے شرف و سعادت نے ایسی بلند نظری اور خود اعتمادی پیدا کردی تھی کہ وہ زندگی کے مصائب و مکروہات اور سیاست کے شور و فتن سے پراگندہ خاطر اور تلخ کام نہیں ہوتے تھے۔ جو شخص ہار جیت دونوں میں اپنا سہارا خود ہو اس کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہوئے ہیں جو نارمل ہوں اور اپنا سہارا خود ہوں

یہاں دو واقعات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں ایک دہلی کی سب سے بڑی مسجد میں پیش آیا، دوسرا ہندوستان کے سب سے بڑے ایوانِ حکومت میں!

۱۹۴۷ء کے اکتوبر میں شمالی ہند کے مسلمان بالعموم اور دہلی کے بالخصوص تقسیم ملک کے تہلکے سے ہراس اور درماندگی کی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ ہندوستان میں کوئی مسلمان لیڈر ایسا نہیں رہ گیا تھا جو ان کو ڈھارس دیتا یا ان کی حمایت میں آگے آتا بلکہ یہ کہنا بھی حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ لیڈر خود سراسیمہ اور درماندہ تھے!

مولانا دہلی کی جامع مسجد تشریف لائے جو مسلمانوں کے جبروت و جلال شوکت و شادمانی، اقبال و اختلال کی کتنی کروٹیں دیکھ چکی تھی۔ مسلمانوں کے خاموش، مایوس اور ملول مجمع کو دیکھا جیسا مجمع آج سے پہلے اُنھوں نے نہ کسی اور نے ہندوستان میں کبھی دیکھا تھا۔ پھر جیسے بوڑھے سردار کی شریانوں میں خون کے ساتھ عزیمت اور حمیت کے شرارے کوندنے لگے ہوں لیکن اپنے

وقار پر قابو رکھتے ہوئے جو اس کا ہمیشہ سے وطیرہ رہا تھا، بولنا شروع کیا...
یہ تقریر اُردو کے بیشتر اخبارات میں تمام و کمال چھپ چکی ہے اور پڑھنے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کو اس کے اکثر ٹکڑے زبانی یاد نہ ہوں، چاہا تھا کہ ناظرین کی خاطر جہاں تہاں سے اس کے اقتباسات ہی پیش کر دوں لیکن اِس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی کہ کس حصے کو حذف کیا جائے اور کس کو نہیں، اس تقریر پر تبصرہ بجائے خود ایک مضمون بن جاتا، اس لئے بادلِ ناخواستہ ارادے سے باز رہنا پڑا، جامع مسجد کی اس تاریخی تقریر سے مسلمانوں کے حوصلے بندھے اور خوف و مایوسی کی تاریکی چھٹنے لگی اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے زلزلے کے بعد زمین کی شکست و شکن میں ہمواری اور اس زمین پر بسنے والوں کے پاؤں میں استقامت آگئی ہو کسے معلوم مولانا، ان کی اس تقریر اور اس مجمع کے ہلکے گہرے نقوش جامع مسجد کے سنگ و خشت، سقف و در، مینار و محراب، نقش و نگار میں کس نامعلوم طریقہ سے پیوست و مرتسم ہو گئے ہوں! اور خدا ہی جانتا ہے کہ قوم کی تقدیر میں ان کی بازگشت کب اور کس طور پر سُنائی دے!

دوسری تقریر پارلیمنٹ میں پرشوتم داس ٹنڈن کے اس اتہام لگانے پر کرنی پڑی کہ وزارتِ تعلیمات ہندی سے سرد مہری برت رہی ہے، اور اُردو کی بے جا پاسداری کرتی ہے، اس اتہام کے پیچھے کھلے چھپے کتنے اور الزامات تھے جن کا اندازہ کرنا ایسا کچھ دشوار ہی نہیں۔ مولانا نے پارلیمنٹ کے آداب اور خود اپنی روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے جس وقار برہم اور صداقتِ بیباک سے جواب دیا وہ ایک ناقابلِ فراموش تاریخی واقعہ بن گیا ہے اس کی روئداد بھی اخباروں میں آچکی ہے جس کو دُہرانے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ پوری

پارلیمنٹ جس کے اراکین میں سے شاید بہتوں نے مولانا کی یہ تقریر پورے طور پر سمجھی بھی نہ ہو مولانا کے خطاب سے سنّاٹے میں آگئے' سکوت کا یہ عالم اور سطوت کا یہ سماں ہندوستانی پارلیمنٹ میں اس سے پہلے شاید ہی کبھی دیکھا گیا ہو! اس کے بعد اُردو کی حمایت کرنا شیوۂ شرافت و انصاف سمجھا جانے لگا۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) کے اس تاریخی جلسے میں جو دہلی میں گزشتہ موسم سرما میں ہوا تھا، مولانا کی اُردو کی حمایت میں آخری تقریر ہوئی' اس کے بعد ہی اُردو کا سب سے بڑا خطیب' اُردو کا سب سے شاندار انشاپرداز اور اُردو ہی کی کتنی حسین اور عظیم شخصیت ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ اب دیکھئے اُردو کے باب میں ع

کسے ہے حکم اذان لا الٰہ الا اللہ

رینانسنس (احیائے علوم) اور ریفرمیشن (اصلاحِ دین) کی دو ایسی زبردست اور عدیم المثال انقلابی تحریکیں یوٗرپ میں برسرکار آئیں جنہوں نے یورپ کو دنیا کی تمام دوسری اقوام سے یکلخت اس درجہ بلند کردیا کہ دوسری قوموں کو صدیوں بعد تک ان مدارج تک پہنچنا نصیب نہ ہوا، ان تحریکوں نے جو کچھ کر دکھایا تاریخِ عالم کے بڑے بڑے کشور کشاؤں کے حصّے میں نہ آیا تھا۔ انسان کی صالح اور صحت مند پوشیدہ قوتوں کو بروئے کار لانے میں مذہب (اعتقاد) اور علوم بڑے زبردست اور پائیدار محرکات ثابت ہوئے ہیں، اسلام، کا ظہور بجائے خود اصلاح ادیان اور احیائے علوم کی براہِ راست بشارت تھا۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رینائسنس اور ریفرمیشن دونوں بڑی حد تک اسلام کا عطیہ ہیں! لیکن مسلمانوں کی عام غفلت اور ان تحریکوں کے غیر معمولی غلبے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان حکومتیں اور مسلمانوں کے عقائد اور اعمال دونوں مغربی افکار

اور استعمار کی زد میں آگئے اقبال نے ٹھیک کہا ہے کہ جو قومیں اپنے اعمال کا حساب نہیں لیتی رہتیں ان کو ایسے ہی بُرے دن دیکھنے نصیب ہوتے ہیں۔ چنانچہ اب مسلمانوں کو ایک طرف اپنی حکومتوں کو، دوسری طرف اپنے افکار و عقائد کو ان قوتوں سے محفوظ رکھنے کی مہم کا سامنا تھا حکومتوں پر کیا گزری یا گزر رہی ہے یہاں خارج از بحث ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ تبدیلی اور اصلاح سب سے دیر میں حکومتیں قبول کرتی ہیں اور ان کا احساس و اظہار سب سے پہلے قوم کے ارباب فکر و نظر کرتے ہیں۔

اب اسلامی عقائد و افکار کو مغربی اور مروجہ عقائد و افکار کی روشنی میں پرکھنے اور تعبیر کرنے کا فریضہ ہندوستان میں غدر کے بعد جن بزرگوں کے حصہ میں آیا اُن میں بعض یہ ہیں: سرسیّد، جسٹس امیر علی، شبلیؔ، اقبالؔ، ابوالکلام اور مولانا مودودی۔ ان سب کا مقصد ایک تھا، طریقۂ کار و استدلال جُدا تھا۔ یہ صورتِ حال مقامی نہ تھی، عالمگیر تھی مصر اور دیگر بلادِ اسلامیہ میں جمال الدین افغانی، مفتی عبدہٗ، رشید رضا وغیرہ کے سامنے بھی یہی مسائل تھے۔

یہاں اس امر کی طرف بھی اشارہ کر دینا غیر متعلق نہ ہوگا کہ اسی زمانے میں ہندوستان میں بھی ہندو عقائد اور قومیت کے، احیاء اور تشکیلِ نو کی تحریک تیزی سے بڑھ رہی تھی جس کے اہم مرکز دکن، بنگال، اور پنجاب میں تھے۔ یہی نہیں بلکہ بدیسی کمپنیوں کی دیکھا دیکھی ہندو سرمایہ دار بھی صنعتی اور اقتصادی محاذ پر پورے طور سے منظم ہو چکے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں کی کیا حیثیت بن گئی تھی، اور مسلمانوں کی کیا رہ گئی تھی!!

غدر کے بعد ہندوستان کے مسلمان جن دشواریوں میں مبتلا تھے، اُن میں بعض یہ تھیں: مغلیہ حکومت کا خاتمہ اور انگریزی حکومت کا قیام، انگریزوں کا

مسلمانوں سے برہم اور برگشتہ ہونا، مسلمانوں کا ضرورت سے زیادہ کبھی آئینِ نو پر اَڑنا، مذہبی اور تہذیبی احیا، اور سیاسی وصنعتی تنظیم میں ہندوؤں کی پیش قدمی، مسلمانوں کی سیاسی کس مپرسی، اقتصادی بدحالی، صنعتی پسماندگی، تعلیمی پستی اور عام مایوسی و درماندگی! سر سید نے ان کا مداوا بہ حیثیت مجموعی علی گڑھ تحریک میں پیش کیا جس کی مرئی اور متعین شکل مدرستہ العلوم کی تھی جو اب مسلم یونیورسٹی ہے۔

مسلمانوں کے نزدیک مسلمانوں کے لئے غدر اُنیسویں صدی کا سب سے المناک انقلابی حادثہ تھا، جس نے ہندوستان میں ان کی کئی سو سالہ سیاسی اور تہذیبی حیثیت کو کلیتہً زیر و زبر کر دیا، مسلمانوں میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت کے فکر و عمل کے لئے یہ صورتِ حال ایک بے امان و بے درماں آزمائش سے کم نہ تھی، نظر برآں علی گڑھ تحریک اور مسلم یونیورسٹی کی اس بنیادی اور تاریخی حیثیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں مسلمانوں کی تقریباً ہمہ جہت آبادکاری و برومندی کا مشن بھی تھیں اور مشین بھی! اور اپنے گوناگوں مقاصد کے حصول میں جو کبھی کبھی ایک دوسرے کے ضد معلوم ہوتے تھے براہِ راست یا بالواسطہ اس حد تک کامیاب ہوئے، جس حد تک ہندوستان کا کوئی اور مسلم ادارہ اب تک کامیاب نہیں ہوا تھا۔

کچھ تعجب نہیں سرسید اور ان کے رفقا نے علی گڑھ تحریک اور مدرستہ العلوم (مسلم یونیورسٹی)، کو کسی نہ کسی حد تک دانستہ یا نادانستہ طور پر رینائسنس اور ریفارمیشن کی روشنی میں آگے بڑھانے کی کوشش کی ہو۔ اس خیال کو اس بناء پر اور تقویت پہنچتی ہے کہ اصلاحِ دین کی تحریک دہلی میں مدتوں سے برسرکار تھی، جو سرسید کے عہد میں اور زیادہ نمایاں ہوگئی تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا گھرانا اس

تحریک میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھا۔ اِسی اصلاحِ دین سے احیائے علوم کے چشمے پھوٹتے تھے۔ پُرانے زمانے میں مسلمان ہی نہیں دوسری اقوام میں بھی علوم کا سرچشمہ مذہب تھا۔ اس وقت مسلمان جن حالات وحوادث سے دوچار تھے ان کے پیشِ نظر علی گڑھ تحریک میں کچھ اور مقاصد بھی شامل کرلئے گئے تھے۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں رینائسنس اور ریفرمیشن کی قیادت کے لئے جس عظیم اور جامع حیثیات شخصیت کی ضرورت تھی، وہ صرف سرسیّد کی تھی، انیسویں صدی کے خاتمہ پر سرسید رحلت فرما گئے، بیسویں صدی کے عشرۂ اوّل میں مسلمانوں کی سیاسی اور قومی زندگی نے جو رنگ اور رُخ اختیار کیا اس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا اس کی قیادت اتنی حرکی، محکم اور ہمہ جہت نہ تھی جتنا کہ وقت کا تقاضا تھا، اس وقت ایک نئے سرسیّد کی ضرورت تھی۔ میرے نزدیک یہ رول مولانا آزاد نے ادا کیا۔

سرسیّد ہی کی طرح وہ اعلیٰ خاندانی روایات، اسلامی علوم، اسلامی تاریخ، اسلامی عقائد، اسلامی اقدار اور اسلامی تہذیب و اخلاق کے حامل اور مبلغ ہونے کے علاوہ سیاسی بصیرت رکھتے تھے، زندگی اور زمانے کے نئے تقاضوں اور رجحانات کو پہچانتے تھے اور ان سے عہدبرآ ہونے کی صلاحیت اور طاقت رکھتے تھے۔ مخالفت کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو اس کا مقابلہ شرافت، قابلیت اور پامردی سے کرتے تھے۔ عربی، فارسی اور اُردو شعروادب کا اعلیٰ ذوق اور تحریر وتقریر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، البتہ ایک بات جو سرسید اور مولانا کو ایک دوسرے سے جُدا اور ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ سرسیّد عامۃ الناس سے بڑا گہرا قریبی اور ہمہ وقت کا تعلق رکھتے تھے، ان میں سے نہ ہوتے ہوئے

بھی جیسے ان ہی میں سے ہوں، ان کے پاؤں زمین میں بڑی مضبوطی سے گڑے ہوئے تھے، اسی وجہ سے وہ چھوٹے بڑے ہر پیمانے پر سوچتے تھے اور اسی کے مطابق کام کرتے تھے۔ سرسید کے عہد میں مسلمانوں پر غدر کی تباہ کاریوں کا شدید اور عالمگیر اثر تھا۔ سرسید کا کمال اور کارنامہ یہ تھا کہ دور اور دیر کی اسکیموں کو بروئے کار لانے کے علاوہ موقع آن پڑتا تو وہ فرسٹ ایڈ (حادثے پر فوری چارہ سازی) بھی کرتے، سرسید کے اس فرسٹ ایڈ کو ان کے بعد آنے والوں نے خود غرضی نا سمجھی کی بنا پر مستقل علاج سمجھ لیا اور کبھی لازمۂ صحت!

مولانا ابوالکلام عوام کے آدمی نہ تھے، کتنے خواص کو بھی ان کے ہاں عوام کے درجے پر اکتفا کرنا پڑتا تھا! شاید انھوں نے اقبالؔ کے عقاب کی طرح چٹانوں کی بلند و ویران تنہائیوں میں اپنی دنیا بنا رکھی تھی، یہ بحث آگے بھی آئے گی۔

یہاں علی گڑھ تحریک اور مسلم یونیورسٹی کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا گیا ہے، مولانا ان تحریکوں کی تائید میں نہ تھے! یونیورسٹی جن شرائط پر یا جن حالات میں قبول کی گئی، اس کے خلاف مولانا کی لکھنؤ میں جو تقریر ہوئی اور اس پر جو مضامین انھوں نے سپردِ قلم کئے وہ کچھ اور نہیں تو بے مثل خطابت، شدید طنز اور اعلیٰ انشا پردازی کے اعتبار سے اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے لیکن تقسیمِ ملک کے بعد جب حالات دگرگوں ہوئے تو مسلم یونیورسٹی کو ہر گزند سے محفوظ رکھنے میں مولانا نے جو خدمات انجام دیں وہ بھی اس ادارے کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کی جائیں گی، ان میں سے ایک ذاکر صاحب کو علی گڑھ کی وائس چانسلرشپ قبول کرنے پر آمادہ کرنا بھی تھا۔ حالات و حادثات کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ ذاکر صاحب اور مولانا دونوں علی گڑھ کے خلاف تھے، لیکن وقت آیا تو ان ہی دونوں کو اس کی حمایت و حفاظت کے فرائض ادا کرنے پڑے "اُبت خانے"

کی یہ "کرامت" کیا کم ہے ع

کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد!

ایسے لوگ کم دیکھے گئے ہیں جو اس کم عمری میں اپنے آپ کو دُنیا کے راستوں پر نہیں بلکہ دنیا کو اپنے راستے پر چلنے کے لئے تیار کر لیتے ہوں، مولانا ابوالکلام ایسے ہی تھے۔ دنیا کے راستے پر چلنے والے دنیا کے اشارے کے محتاج ہوتے ہیں۔ مردانِ کارِ آگاہ کے بنائے ہوئے راستے پر چلنے کے لئے خود دنیا ان کے اشارے کی محتاج و منتظر ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ مولانا تمام عمر خود کسی کے مشورے یا مدد کے خواستگار نہیں ہوئے، ان کی مدد اور مشورے کے محتاج و منتظر دوسرے رہے۔ وہ صرف اپنے بنائے ہوئے معیارِ خوب و زشت کی پابندی کر سکتے تھے!

مولانا عزلت نشین، دیر آشنا اور کم آمیز تھے۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے کے "خاصانِ بارگاہ" سب سے کنارہ کش ہو کر زندگی کا وہ زمانہ جو ترغیباتِ نفس کے اعتبار سے غفلت اور غلبے اور ضمیر و دانش کے اعتبار سے نیم پختہ ہوتا ہے، عبادت میں گزارتے ہیں۔ اس خلوت، عبادت اور ریاضت (اعتکاف) کا مقصد مطالعۂ ذات اور محاسبۂ نفس ہوتا ہے، اس سے ان پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ان کی زندگی کا مشن کیا ہے اور وہ خلقِ خدا کی کس خدمت پر مامور (من اللہ) ہونے والے ہیں۔ ان مراحل سے گزرنے کے بعد وہ دعوتِ حق اور خدمتِ خلق کے لئے عامۃ الناس میں آتے ہیں۔ یہ تو نہیں بتا سکتا کہ مولانا بھی زندگی کے کسی خاص عہد میں اس مرحلے و منزل سے گزرے یا نہیں اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اس مطالعے مجاہدے میں کسی نہ کسی حد تک مولانا آخر دم تک منہمک رہے۔ اپنے محاسبے کے لئے اپنی کمین گاہ میں بیٹھنا ایک بات ہے اور بہت بڑی بات

ہے، اور اپنی بنائی ہوئی جنّت یا خانقاہ میں بیٹھنا قطعاً دوسری بات ہے اور بہت معمولی بات ہے، اوّل الذکر حالت وسیلہ ہے ایک بڑے مقصد کا، اور مؤخرالذکر بجائے خود ایک مقصد ہے، لیکن ادنیٰ مقصد ہے، ایک پناہ لیتا ہے دوسرا بے پناہ بنتا ہے! اتنا ہم سب جانتے ہیں کہ مولانا کا مزاج خانقاہی نہ تھا۔ آخرت میں مولانا کے ساتھ جنّت کیا سلوک کرے وہ تو مجھے نہیں معلوم، دنیا میں تو مولانا نے جنّت کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا۔

مولانا کی رہبری میں پیغمبرانہ طریقِ دعوت کے بجائے آمرانہ شان اور کبریائی کی ادا تھی، وہ اتنے پبلک کے نہیں تھے جتنے لیڈروں کے لیڈر تھے۔ مولانا اپنے آپ کو عوام سے زیادہ خواص کی راہ نمائی پر مامور سمجھتے تھے!

مولانا کا اسلوبِ تحریر اِن کی شخصیت تھی۔ اور ان کی شخصیت ان کا اسلوب، دونوں کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ صاحبِ طرز کی ایک نشانی یہ بھی ہے! مولانا نے لکھنے کا انداز، لب ولہجہ اور مواد کلامِ پاک سے لیا جو ان کے مزاج کے مطابق تھا۔ مولانا پہلے اور آخری شخص ہیں جنہوں نے براہِ راست قرآن کو اپنے اسلوب کا سرچشمہ بنایا۔ وہی اندازِ بیان اور زورِ کلام اور وعید وتہدید کے تازیانے جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ پہاڑوں پر رعشۂ سیماب طاری کر دیتا ہے۔ مولانا کی تحریروں میں وہ نرمی اور نوازش نہ ملے گی جو پیغمبروں کی دعوت میں ملتی ہے۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، مولانا کی طبیعت پیغمبری کے رول سے اتنی سازگار نہ تھی جیسی خدائی کے رول سے! خدا پیغمبروں کی طرح انسانوں میں گھلا ملا نہیں ملتا، اس لئے کہ پیغمبروں کی طرح وہ انسانوں میں نہیں ہوتا، اس لئے خدا کے خطاب کرنے کا انداز پیغمبر یا انسان کے طرزِ خطاب سے جُداگانہ ہوتا ہے، یہاں پہنچ کر یہ بھید کھلنے لگتا ہے کہ مولانا کی تحریروں میں انانیتی رنگ اور خطابت کا

غلبہ کہاں سے آیا!

صحفِ سماوی میں جو باتیں بتائی گئی ہیں، انسان نے ہمیشہ ان کو اپنے بہترین احساسات کے مطابق فنونِ لطیفہ میں تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے مذہبی افکار کو شعروادب سے اور شعروادب کو مذہبی افکار سے سب سے زیادہ تازگی اور توانائی ملی ہے، فارسی اور اردو نظم میں رومی اور اقبال نے جس حرارتِ دینی، علمی تبحّر، عصری بصیرت، شاعرانہ حسن کاری اور فنِ قدرت سے کلام پاک کو متعارف کیا، اس کی جھلک اگر کہیں ملتی ہے تو ڈانٹے اور ملٹن کی نظموں میں. جو عیسوی تصوّراتِ مذہب کی رہینِ منّت ہیں۔ ان مشہورِ عالم شعراء کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے جنّت اور جہنّم کے اسلامی تصوّرات سے بھی خوشہ چینی کی ہے. کلام پاک کی تعلیمات اور تصوّرات کو اُردو میں اس بصیرت، زیبائی و برنائی کے ساتھ پیش کرنا کہ وہ اللہ کا کلام ہی نہیں بندوں کا عملِ صالح بھی معلوم ہو، معمولی ذہن و دماغ کا کام نہیں۔ اُردو میں یہ کارنامہ مولانا آزاد کا ہے!

عربی زبان کے معیار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دنیا کے دور دراز گوشوں میں آغازِ اسلام سے آج تک یکساں بلند ہے جس کا سب سے بڑا سبب کلامِ پاک کی غیر متبدّل زبان و بیان اور اس کے معانی و مطالب کا عالمگیر اثر و نفوذ ہے، ان قوموں سے قطع نظر جن کی مادری زبان عربی ہے بے شمار ایسے مسلمان ہیں جن کی مادری زبان کچھ ہے لیکن کلامِ پاک کی تلاوت و ترتیل، اور اوراد و وظائف کے التزام، مذہبی فرائض بجالانے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر روزانہ کی زندگی میں عربی فقروں کے زبان زد ہوتے رہنے سے عربی ان کی زندگی میں دخیل اور ان کے ذہنوں میں پیوست ہوگئی ہے، اس کے علاوہ مسلمانوں کے چھوٹے بڑے بے شمار عربی مدراس ہیں جہاں قدیم زمانے سے آج تک اس کی مکمّل تعلیم

دی جاتی ہے، اب سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کی علمی، تصنیفی اور ادبی زبان بھی عربی تھی، ایک حد تک فارسی کو بھی یہی درجہ حاصل ہے۔

یہاں عربی اور فارسی زبانوں کی خوبیوں پر تفصیل سے گفتگو کرنا مقصود نہیں ہے۔ بتانا صرف اتنا ہے کہ عربی میں کلام پاک کا ہونا عربی زبان کی شہرت اور بقا کی ایسی ضمانت ہے جس کو زوال نہیں اور اس کا صحیح عمل دخل جہاں کہیں زبان اور قوم میں ملے گا ان میں حسب استعداد عربی زبان اور عرب قوم کی تازگی اور توانائی بھی ملے گی، فارسی اور عربی شعر و ادب پر مولانا کو جو غیر معمولی عبور تھا اور ان کا ذوق جس طرح ان کی ذہن و فکر میں رس بس گیا تھا۔ وہ مولانا کے قلم اور زبان سے اُردو میں سہ آتشہ ہو کر نمودار ہوا!

یہ بات صرف عربی فارسی زبانوں تک محدود نہیں ہے، زبان کے معیار کو بلند اور کارآمد رکھنے میں الہامی اور کلاسیکی زبانوں کی اہمیت مسلم ہے بشرطیکہ، اور یہ بہت بڑی شرط ہے کہ ان زبانوں کا اثر اور ان کی افادیت بولنے اور لکھنے والوں کی عملی زندگی میں مسلسل اور مؤثر طریقے پر ملتی ہو، زبان نہ اپنے حسب نسب کے اعتبار سے ترقی کرتی ہے نہ زبان کے بے وقوف دوستوں کے حسب نسب سے، وہ ترقی کرتی ہے بولنے اور لکھنے والوں کی ہر طرح کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھنے سے!

سرسید، شبلی، حالی، نذیر احمد، محمد حسین آزاد سب کے انداز میں لکھنے والے ہمارے یہاں مل جائیں گے لیکن مولانا کا پیرو ایک نہ ملے گا، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پیرو کا نہ ملنا مولانا کی بڑائی میں کوئی اضافہ ہے، اگر کوئی یہ کہے کہ مولانا کا اسٹائل ادب اردو کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں یا اس کی فائدہ رسانی کی عمر ختم ہو چکی یا مولانا کی تحریروں میں اسٹائل کا غلبہ اور مواد کی

کمی ہے یا مولانا کے مضامین کا ترجمہ کسی ایسی زبان میں، جو عربی فارسی کی جنییس (GENIUS) سے نا آشنا ہو، کامیاب نہ ہوگا۔ تو میں اس سے "جدالِ سعدی" قسم کی تفریح پر بھی آمادہ نہ ہوں گا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ یہ بے مثل اسلوب جس میں "عجم کا حسنِ طبیعت" اور "عرب کے "سوز دروں" کے ساتھ "شکوہ ترکمانی"، ذہن ہندی، نطق اعرابی" بھی ملتا ہے، مولانا پر ختم ہوگیا، ایک جگہ عرفی نے اپنے اندازِ خاص سے ماتم کیا ہے کہ تمام شہر و دیار چھان ڈالے لیکن "نیافتم کہ فروشند بخت در بازار!" نصیبے کی طرح اسٹائل کا بھی یہی حال ہے بالخصوص مولانا کے اسٹائل کا!

صحافت کو ادب میں جگہ نہیں دی گئی ہے۔ اس کی سرگرمیاں بالعموم روزمرہ کے حالات و حوادث پر رائے زنی تک محدود ہوتی ہیں، مسائلِ حاضرہ پر تبصرہ اور خبریں پڑھ کر ہم دوبارہ اخبار کی طرف التفات نہیں کرتے، اخبار کے بارے میں کبھی کبھی ایک کہاوت بھی سُننے میں آجاتی ہے یعنی اتنا باسی جتنا کہ گزرے ہوئے دن کا اخبار! ہمارے بعض بڑے اچھے شاعر اور نثر نگار صحافت کے نشے یا طلسم میں ایسے اسیر ہوئے کہ آخر تک نکل نہ پائے اور ان کی تحریریں "صحافتی" قرار پائیں۔

مولانا کا ابتدائی عہد (جنگ سے پہلی جنگِ عظیم تک) اُردو صحافت کا زرّیں دور تھا۔ گذشتہ پچاس سال میں اُردو کے اچھے سے اچھے اخبار اور ان کے مدیر قوم اور ملک سے روشناس ہوئے جنہوں نے جرنلزم کو بڑی ترقی دی، لیکن سوائے مولانا کے کسی اور کو ایڈیٹر کی حیثیت سے ادب کی صنفِ اوّل میں جگہ نہ ملی اور صرف الہلال اور البلاغ کے مضامین کو علمی اور ادبی درجہ نصیب ہوا۔

بذاتِ خود نہ مولانا کو متداول معنوں میں صحافی سمجھتا ہوں نہ الہلال اور

البلاغ کو صرف اخبار۔ مولانا کسی مسئلہ پر نہ سرسری طور سے غور کرتے تھے نہ اظہارِ خیال۔ بلکہ اس کا التزام رکھتے تھے کہ جو بات کہی جائے وہ مسلمات کی روشنی کی تاب۔ لا سکے، کسی بڑی حقیقت سے رشتہ رکھتی ہو اور علمی و ادبی معیار پر صحیح اُترے، ادارت کے مصروف پروگرام اور گریز پا لمحات میں اس التزام کا نباہنا تقریباً ناممکن ہے، صرف مولانا ایسا کر سکتے تھے۔ اردو صحافت کو مولانا نے کلاسکس کا درجہ عطا کیا۔ مولانا کی تحریر صحافتی نہیں تصنیفی ہوتی تھی۔ نظر حکیمانہ، انداز خطیبانہ اور آہنگ ملہمانہ! ان کی تحریروں تقریروں نیز ان کے سراپا کا جب کبھی خیال آتا ہے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ازمنۂ قدیمہ میں یونان کے زندہ جاوید رزمیہ نگار مصروفِ کار ہوں، اپنے زمانے اور اپنے دیار میں مولانا یونانی دیوتاؤں سے کم نہ تھے!

مولانا کے یہاں انشا پردازی کے ایک سے زیادہ اسالیب ملتے ہیں، الہلال میں دعوت دار و رسن ہے، تذکرے میں دعوتِ دید و شنید، غبارِ خاطر میں دعوتِ نوش و نشید، تفسیر قرآن کا لب و لہجہ علمی اور عالمانہ ہے۔ ع

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جُدا جُدا!

غالباً الہلال اور تذکرہ ہی کے زمانے میں مولانا نے تفسیر کا کام شروع کر دیا تھا۔ کلامِ پاک کا ترجمہ کرنا آسان نہیں ہے لیکن تفسیر کا کام بدرجہا مشکل اور نازک ہے۔ اِس لئے کہ اس میں عربی زبان و بیان پر عبور ہونے کے علاوہ اقوامِ عالم کی تاریخ پر نظر، عقیدے کی محکمی اور سیرت کی پختگی و پاکیزگی لازمی شرائط ہیں۔ تفسیر میں مفسّر کے نقطۂ نظر کا راہ پا جانا جتنا نامناسب ہے، اتنا ہی ناگزیر بھی ہے، تفسیر میں ایسے مقامات آتے ہیں جہاں تاویل و تعبیر کے ایک سے زیادہ پہلو نکلتے ہیں۔ چنانچہ الہامی اور مذہبی کتابوں پر معتقدین اور منکرین نے

بربنائے اعتقاد یا انتقاد اب تک جتنے متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے وہ شاید ہی کسی اور نوعیت کی کتاب کے بارے میں دیکھنے میں آئیں۔

تفسیر لکھنے والوں کا کبھی کبھی مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کی تاویل کلامِ الٰہی میں پالیں —— مولانا نے اپنی تفسیر میں (جو شاید پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی)، اس کا لحاظ رکھا ہے کہ کلامِ الٰہی میں اپنے نقطۂ نظر کا جواز نکالنے کے بجائے کلام پاک ہی کے نقطۂ نظر کو پانے اور پیش کرنے کی کوشش کی جائے، یہ کام بڑی دیانت اور جرأت کا ہے!

قلعۂ احمد نگر کے ایام اسیری میں مولانا کا غبار خاطر لکھنا ایک دلچسپ مطالعہ ہے، غبارِ خاطر کہنے کو تو مولانا کے خطوط ہیں اور نواب صدر یار جنگ مرحوم کے نام لکھے گئے ہیں لیکن مولانا کے اندازِ طبیعت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اکثر ایسا محسوس ہوا جیسے مولانا نے یہ خطوط دراصل اپنے ہی نام لکھے ہوں۔ اس لئے کہ یہ اتنے خطوط نہیں معلوم ہوتے جتنی خود کلامی! مولانا اپنے سوا کسی سے اتنے بے تکلف نہیں ہو سکتے تھے کہ اس کو ایسے خطوط لکھتے۔ اپنے سے بھی مولانا بڑی مشکل سے بے تکلف ہوتے تھے!

یہاں پہنچ کر کچھ اس طرح کا احساس ہونے لگتا ہے جیسے کسی نے اپنے عزیز یا دوست سے دانستہ یا نادانستہ تمام عمر بے التفاتی برتی ہو لیکن آخر میں تلافیٔ مافات کا خیال آئے تو اس پر نوازشوں کی بارش کر دے۔ مولانا نے سیاست کے خارزار اور قومی زندگی کی بے آب و گیاہ وادی میں تمام عمر اپنے نفس کو ہر لذت سے محروم اور ہر محرومی سے دوچار رکھا لیکن آخر زمانے میں جب اس فروگذاشت کا خیال آیا تو اس پر اپنے اعتماد کا اظہار کرنا شروع کر دیا، چنانچہ یہ خطوط ایک طور پر نتیجہ ہو سکتے ہیں مولانا کے اپنے نفس سے بدلے ہوئے

خوشگوار رویے کا!

دوسری بات جو مولانا کی انشاء پردازی کے بارے میں ان خطوط سے منکشف ہوتی ہے وہ ان کی طبیعت کا انبساط اور شگفتہ، شاداب اور صحت مند انشاء پردازی پر ان کی غیرِ معمولی قدرت ہے۔ غبارِ خاطر میں مولانا کی حسنِ طبیعت کا وہ اظہار ملتا ہے جو رقعاتِ غالب میں غالبؔ کا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ غبارِ خاطر سے پہلے مولانا کی انشاء پردازی پر ابتدا سے جو خطیبانہ اور ملہمانہ رنگ طاری تھا۔ اس کا فشار اگر بالکل دور نہیں تو بہت کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ غبارِ خاطر وجود میں نہ آتا تو مولانا کی شخصیت اور انشاء پردازی کا ایک بڑا دل آویز پہلو ہماری نظروں سے اوجھل رہتا!

الہلال اور تذکرہ کے عہد میں مولانا کا جو اسلوب تحریر ملتا ہے وہ اقتضائے زمانہ کے مطابق تھا، اور اپنی خوبی اور خوبصورتی کے باوجود زمانے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا لیکن غبارِ خاطر کا اسلوب اُردو میں نامعلوم مدت تک زندہ رہے گا، اکثر بے اختیار جی چاہنے لگتا ہے، کاش اس اسلوب کے ساتھ کچھ دن اور جیئے ہوتے، پھر ہمارے ادب میں کیسے کیسے نسرین و نسترن اپنی بہار دکھاتے اور خود مولانا کے جذبہ و تخیل کی کیسی کیسی کلیاں شگفتہ ہوتیں!

ملک کی آزادی کی تحریک میں مسلمان اکابر کو اسیری نصیب ہوتی تو بالعموم ان کا ذہن مذہبی کتابوں کے مطالعہ کی طرف مائل ہوتا۔ ان میں سے اکثر اپنے تاثرات بھی قلم بند کرتے۔ آزاد فضا کی حشر زائیوں کے بعد جیل کی ساکن، بے رنگ اور ویران زندگی کی معمولات کا سامنا ہو تو اسیروں کا افکار اور جذبات کی اپنی بنائی ہوئی بے کنار و بوقلموں دنیاؤں میں پناہ لینا فطری ہے جو ان کو پہلے نصیب نہ ہوتی۔ مسلمانوں ہی پر موقوف نہیں۔ یہ صورتِ حال سب پر گزری ہے۔ کسی نے

لڑکی کو خط لکھے، کسی نے بیوی کو، کسی نے اپنے آپ کو!۔

قیاس یہ ہے کہ جس زمانے میں مولانا رانچی میں نظر بند تھے، تفسیر کا کام جس کی ابتدا الہلال اور البلاغ کے صفحات سے ہو چکی تھی، بڑی تندہی سے شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں مولانا کی سرگرمیاں تمام تر سیاسی مذہبی یا مذہبی سیاسی کی نوعیت کی تھیں، یعنی کبھی کشتی سیاسی ہوتی بادبان مذہبی ہوتے اور کبھی اس کے برعکس۔ جہاں تک خیال ہے، یہ تفسیر ناتمام رہی اور صرف دو جلدیں شائع ہوئیں۔ رانچی سے احمد نگر تک کی مدت اتنی تھی کہ یہ کام مکمل ہو سکتا تھا، لیکن ایسا نہیں ہوا اور آخری اسیری کا زمانہ مولانا نے کتاب الٰہی کی تفسیر لکھنے کے بجائے "کتابِ دل" کی تفسیر لکھنے میں صرف کیا! ایسا تو نہیں کہ زندگی کے آخری دور میں مولانا لازمانی اور لامکانی کے بجائے "زمینی و زمانی ہو گئے ہوں، اگر ایسا ہے تو یہ تبدیلی بڑی مبارک اور انقلابی تھی۔

جیسا کہ اس سے پہلے ظاہر کر چکا ہوں، تقسیم ملک کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کے وہ تنہا سہارا رہ گئے تھے۔ حکومت کے بڑے اہم منصب پر فائز رہ کر اور بے شمار نزاکتوں میں گھرے ہونے کے باوجود مولانا نے یہ فرض جس خوبی سے انجام دیا وہ بیان سے باہر ہے۔ مولانا کے اُٹھ جانے کے بعد کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ منصب ان پر ختم ہو گیا ہو۔

یہاں پہنچ کر یہ بات بھی دل میں آتی ہے کہ حکومت کیسی ہی ہو آزادی اور تندہی سے قوم کی خدمت کا کام حکومت سے باہر ہی رہ کر زیادہ مؤثر طور پر انجام دیا جا سکتا ہے، کچھ اور نہیں تو اس بنا پر کہ حکومت میں رجعت پسندی اور عامۃ الناس میں ترقی پسندی کی استعداد خلقی ہے۔ اوّل الذکر کی تقدیر سکونی ہے، مؤخر الذکر کی حرکی!

قطع نظر اس سے کہ مولانا حکومت سے کس درجہ وابستہ ہو گئے تھے، اس سے باہر نکل سکتے بھی تھے یا نہیں، ان کو نکلنے بھی دیا جاتا یا نہیں یا ان کی صحت اس کی کہاں تک متحمل ہوتی، کبھی کبھی یہ بات ذہن میں آتی ہے کاش وہ حکومت کے محدود اور گلوافشار حلقے سے باہر نکل کر ہندی جمہوریہ کے دستور میں ہندی مسلمانوں کو وہ مشکل لیکن مہتم بالشان مقام دلا سکتے جو مسلمانوں کا حق بھی ہے اور ذمہ داری بھی!

جی ایسا کیوں چاہتا ہے، شاید اس لئے کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی سردار دُور دُور نظر نہیں آتا جس کے سپرد ہندوستانی مسلمانوں کی حمایت و ہدایت کی ذمہ داری اعتبار و افتخار کے ساتھ جا سکے۔ ؏

اللہ رے سنّاٹا آواز نہیں آتی

پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس)

پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) دفعتہً ہم سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گئے، ان کی باتوں اور تحریروں سے بے شمار لوگوں کے دل خوش ہوئے اور ہوتے رہیں گے، اللہ تعالےٰ نے ان سے اتنی بڑی خدمت لی تو یقیناً ان کو اپنی بے کراں نوازشوں سے سرفراز بھی فرمایا ہوگا۔

اگر ہم ذہن میں کسی ایسی محفل کا نقشہ جمائیں جہاں تمام ملکوں کے مشاہیر اپنے اپنے شعر و ادب کا تعارف کرانے کے لئے جمع ہوں تو اُردو کی طرف سے ہم ہم بہ اتفاق آرا کس کو اپنا نمائندہ انتخاب کریں گے؟ یقیناً بخاری کو، بخاری نے اس قسم کے انتخاب کے معیار کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ نمائندوں کا حلقہ مختصر ہوتے ہوتے معدوم ہونے لگا ہے، یہ بات کس وثوق سے ایسے شخص کے بارے میں کہہ رہا ہوں جس نے اُردو میں سب سے کم سرمایہ چھوڑا ہے لیکن کتنا اونچا مقام پایا۔

تاریخ اور تفصیل میں کون پڑے، اتنا البتہ یاد ہے کہ سب سے پہلے "راوی" میں پطرس کا مضمون "کتے" پڑھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے لکھنے والے نے اس مضمون سے جو درجہ حاصل کر لیا وہ بہتوں کو تمام عمر نصیب نہ ہوگا، ظرافت نگاری میں پطرس

کا ہمسر ان کے ہم عصروں میں کوئی نہیں۔ طنز و ظرافت آسانی سے ہاتھ آجانے والے لیکن پرپیچ اور خطرناک آلے ہیں۔ ہنسی، دل لگی یا طعن تشنیع کسے نہیں آتی۔ لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کب ہنسنا چاہیئے، کس پر ہنسنا چاہیئے کتنا ہنسنا چاہیئے، اور سب سے مشکل یہ کہ کیسے ہنسنا چاہیئے۔ انسان ہنسنے والا جانور کہا جاتا ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ بعض اِس طرح ہنستے ہیں، ممکن ہے اسی سبب سے بقیہ جانوروں نے ہنسنا چھوڑ دیا ہو، بخاری ان رموز سے واقف تھے۔

جو بات ظرافت کے بارے میں کہی گئی ہے وہی طنز پر بھی صادق آتی ہے۔ دونوں کی بدنصیبی یہ رہی ہے کہ سہل الحصول ہونے کے سبب سے ہم ان ذمہ داریوں کا پورا خیال نہیں کرتے جو ان کی طرف سے ہم پر عائد ہوتی ہیں، اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ سستی طنز و ظرافت بہت مہنگی پڑتی ہے، یعنی احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو طنز و ظرافت سے کام لینے والا طنز و ظرافت کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہم میں سے اکثر اس کا شکار ہیں۔ صرف محسوس نہیں کرتے۔

طنز کی محرک برہمی یا بیزاری ہوتی ہے۔ ظرافت کی تفریح و تفنّن، ان کا رشتہ نفسِ واقعہ سے بھی ہے اور فن کار کے ردِّ عمل سے بھی۔ ایک ہی واقعہ ایک شخص کو ایک طرح سے متاثر کرتا ہے اور دوسرے کو دوسری طرح، ایک اس سے برہمی یا بیزاری کا اظہار کرے گا، دوسرا اس کے مضحک یا تفریحی پہلو کو اُبھارے گا۔ اس کے اس کے بعد یہ دیکھتے ہیں کہ جس فن کار کا جیسا ردِّ عمل ہوا ہے اس کا اظہار اس نے کس طرح کیا ہے یعنی فن کار کی شخصیت کس پائے کی ہے اور فن پر اس کی گرفت کیسی ہے۔ نادانستہ طور پر یہ بحث اس منزل پر آگئی جہاں شخصیت اور فن کے رشتے سے بحث کرنا ضروری ہو جاتا ہے لیکن

یہاں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ فن کو شخصیت سے توانائی اور توثیق ملتی ہے اور فن کی غلامی شخصیت کی نامحکمی کی دلیل ہے۔ فن ٹکنیکل اور مکینکل ہوتا ہے اور شخصیت عطیۂ الٰہی ہے جو ریاضت اور انتظار سے جلا پاتی ہے۔

آج کل طنز و ظرافت میں جس چیز کی کمی خاص طور پر محسوس ہوتی ہے، وہ شخصیت ہے۔ سبب یہ ہے کہ ہمارے بیشتر لکھنے والے بندھے ٹکے موضوعات کے اسیر ہو گئے ہیں، جن پر طنز و ظرافت کا عمل کوشش کئے بغیر کارگر ہو سکتا ہے، مثلاً بیوی، نیتا، مولوی، والدین، مہنگائی، چور بازاری، نفع خوری اقربا پروری، لڑکے لڑکیوں کی بے راہ روی وغیرہ۔ ان سب پر طبع آزمائی کی تھوڑی بہت داد بھی مل جاتی ہے جیسے کسی تھکے ہارے شاعر کو اس سے زیادہ تھکے ہارے شعر پر اسی طرح کے حاضرین داد دیتے ہوں۔ مضحک کو مضحک دکھانے بتانے کا کوئی نتیجہ نہیں۔ یہ سستا اور فضول کاروبار ہے۔ شخصیت کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ معمولی کو غیر معمولی بنا دے یعنی طنز و ظرافت کے پہلو وہاں دیکھ لے جہاں کسی دوسرے کا ذہن آسانی سے نہ پہنچ سکتا ہو۔ طنز و ظرافت کے یہی نمونے فنکار کی شخصیت کی کشید ہوتے ہیں اور اچھے ادب اور اچھے ذہنوں میں جگہ پاتے ہیں۔

بخاری کی ظرافت بندھے ٹکے موضوعات، روایتی کرداروں اور لفظی ہیر پھیر سے بے نیاز ہوتی ہے۔ ہر جگہ ہر بات میں اُنھوں نے خوش طبعی اور زندہ دلی کا پہلو نکالا ہے، جیسے "صحرا کو مسکرا کے گلستاں بنا دیا" ہو۔ بخاری کی ظرافت عام طور سے مفرد ہوتی ہے، مرکّب نہیں۔ بعض اطبّا بڑے سے بڑے امراض کا بھی علاج جڑی بوٹیوں سے کرتے ہیں۔ بعض دوسرے معمولی امراض کے لئے مرکّب دوائیں مثلاً معجون، گولیاں، کشتہ جات تجویز کرتے ہیں۔ علاج دونوں مستند ہیں لیکن اوّل الذکر زیادہ مشکل، اِس لئے زیادہ قابلِ تعریف ہے۔ بخاری

ظرافت کو ظرافت ہی کے سہارے قائم رکھتے ہیں اور اس سے ہر مقصد حاصل اور ہر مشکل حل کر لیتے ہیں۔ اُن کی ظرافت کی تعبیر آتش کے اس شعر سے کی جا سکتی ہے ؎

آیا تھا بلبلوں کی تدبیر میں، گلوں نے
ہنس ہنس کے مار ڈالا صیاد کو چمن میں

ہنس ہنس کے مار ڈالنے کا گُر، بخاری کو خوب آتا تھا ظرافت اور ظرافت نگاری کی یہ معراج ہے۔

بخاری کی ظرافت نگاری کی مثال داغ کی غزلوں اور مرزا شوق کی مثنویوں سے دے سکتے ہیں جس طرح ان بے نظیر فن کاروں نے ماجرائے حُسن و عشق کو قضیۂ زمیں برسرِ زمیں ہی رکھا ہے، مزرعۂ آخرت بنانے کی کوشش نہیں کی، اسی طرح بخاری نے ظرافت کو زمینی اور زمانی ہی رکھا، ماورائی و لامکانی بنانے کی فکر میں نہیں پڑے۔ مزے کی باتیں مزے سے کہتے ہیں اور جلد کہہ دیتے ہیں، انتظار کرنے اور سوچ میں پڑنے کی زحمت میں کسی کو مبتلا نہیں کرتے، یہی سبب ہے کہ وہ پڑھنے والوں کا اعتماد بہت جلد حاصل کر لیتے ہیں۔ ترشے ہوئے فقروں اور ڈرامائی انداز سے عامی اور عالم دونوں کو مسرور کرنے اور مسخّر رکھنے کا سلیقہ جتنا بخاری کو تھا کسی اور کے ہاں کم نظر آتا ہے۔

بعض مشاہیر کو کبھی کبھی اس شوق میں بھی مبتلا دیکھا گیا ہے کہ وہ بدیہہ گو، بذلہ سنج اور داستان طراز بھی سمجھے جائیں، اس کی آسان ترکیب یہ نکالی ہے کہ بے شمار لطیفے از بر کر لئے جائیں جن کو موقع بے موقع (کبھی ایسے بھونڈے طریقے سے، جیسے بعض شعراء اپنا کلام سُنانے کے لئے کسی شریف آدمی کو گھیر لیتے ہیں) سُناتے رہیں گے۔ وہ یہ نہیں جانتے ظرافت کا مدار ذوق پر ہے حافظے پر نہیں۔

بخاری فقروں اور لطیفوں کی تجارت نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر طرح کی متاع ہر جگہ پیدا کر لیا کرتے تھے، تجارت کے لئے نہیں تواضع کے لئے وہ اپنی تحریر و تقریر میں لطیفوں اور چٹکلوں کے پیوند نہیں لگاتے تھے بلکہ طبّاعی اور زندہ دلی ان کی رگ و پے میں ساری تھی، اور طرح طرح سے جلوے دکھاتی تھی۔ وہ لطیفہ خواں نہ تھے، لطیفہ طراز تھے، ممکن ہے بخاری سے کبھی کسی کو تکلیف بھی پہنچی ہو لیکن اتنا یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان سے ایک ہی لطیفہ دوسری بار یا کئی بار سُننے کی کوفت شاید ہی کسی شخص کو ہوئی ہو۔

غالباً ۱۹۴۵ء میں پی۔ای۔این کا سالانہ اجلاس جے پور میں منعقد ہوا تھا، ای، ایم، فاسٹر، سروجنی نیڈو، جواہر لال نہرو، رادھا کرشنن، صوفیا وادیا، مرزا اسمٰعیل، ملک راج آنند، بخاری اور کتنے اور مشاہیرِ علم و ادب ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے شریکِ جلسہ تھے۔ موسم خوشگوار، جے پور کا تاریخی خوبصورت اور ستھرا شہر، ریاست کی روایتی مہمان نوازی، مرزا اسمٰعیل کا انتظام، جو اس زمانے میں ریاست کے وزیرِ اعظم تھے، پی۔ای۔این کا ایسا شاندار اجلاس ہندوستان میں شاید ہی اس سے پہلے یا اس کے بعد منعقد ہوا ہو۔ تین دن تک کیسی کیسی عالمانہ تقریریں ہوئیں۔ بلند پایہ مقالے پڑھے گئے، علمی مذاکرے رہے، بے تکلف ملاقاتیں اور پُر تکلف دعوتیں ہوئیں۔

بخاری کی علمی شہرت، بے اختیار متوجّہ کرنے والی شخصیت حسین و ذہین خدوخال، سجل اور ستھرا لباس، بے تصنّع خرام و قیام، ہر شخص سے اس کے مناسبِ حال گفتگو، مزے کی بھی، پتے کی بھی، ہر شخص کی نگاہیں پڑتی تھیں لیکن ان کا اپنا انداز یہ تھا کہ مشاہیر کے حلقوں میں یونہی کبھی گھومتے پھرتے نظر آجاتے، جیسے ان پر کرم کرنے نکل آئے ہوں، ورنہ بیشتر عام لوگوں اور اپنے

ساتھیوں کے حلقوں میں مگن رہتے تھے۔ بخاری ایسے یُوسف تھے جو کبھی بے کارواں نہیں رہے۔ مقالہ پڑھا تو دھوم مچ گئی۔ اُردو اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ادیبوں کے ایک بُنیادی مسئلہ کو پہلی بار نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ بحث تفصیل سے یاد نہیں۔ اُنھوں نے کہا، ہندوستانی ادیب مادری زبان اور انگریزی کے درمیان معلّق ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ "دولسانی" کشمکش ان کے فکر و نظر کو فطری رنگ میں جلوہ گر ہونے نہیں دیتی۔ وہ اپنی زبان کی پرداخت اور اُس کے حسُن کے صحیح احساس سے محروم ہوتے جا رہے ہیں، دوسری طرف انگریزی ادب کے اصل خدوخال اور مزاج کو اپنانے کے لئے جس ریاضت و بصیرت کی ضرورت ہے اس کے نہ خوگر ہیں نہ اس سے پورے طور پر آشنا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ وہ کلاسیکی ادب کی اساسی قدروں کا صحیح عرفان نہیں رکھتے۔ اس لئے جدید ادب کے افکار کو پرکھنے کی صلاحیت سے بیگانہ ہیں۔ ان کا پُورا زور ماضی کو سمجھے بغیر اِس سے رشتہ توڑنے اور بغیر پرکھے جدید سے رشتہ جوڑنے پر صرف ہو رہا ہے۔ بخاری کے ان خیالات کو کانفرنس میں بڑی اہمیّت دی گئی اور سب کو اس کا احساس ہوا کہ اتنے اہم موضوع پر کتنی فکر انگیز بات کس وضاحت سے کتنے بڑے مُبصّر نے کہی۔

آل انڈیا ریڈیو کا محکمہ دہلی میں قائم ہوا تو اس کے عملے کا تقرّر ایک بورڈ نے کیا جس میں مسٹر فیلڈن، ڈائرکٹر جنرل، بخاری، ڈاکٹر کریم حیدر لودھی اور کچھ اور لوگ تھے جن میں ایک میں بھی تھا۔ صدر فیلڈن تھے۔ اس بورڈ کی سفارش پر ذوالفقار بخاری، آغا اشرف، مجازؔ مرحوم اور بعض دوسرے لوگوں کا مختلف آسامیوں پر تقرر ہوا تھا۔ فیلڈن بڑے ذی استعداد، جری اور آزاد خیال تھے۔ ریڈیو کا کاروبار سنبھالنے ولایت سے نئے نئے آئے تھے۔ حکومتِ ہند کے اعلیٰ انگریز عہدیداروں تک کی پروا نہ کرتے تھے لیکن بخاری کا کلمہ پڑھتے تھے

اور ان کے اشاروں تک کا احترام کرتے تھے۔

جیسا کہ قاعدہ ہے اُمیدواروں سے ہر ممبر اپنے اپنے مضامین کے بارے میں تھوڑی بہت گفتگو کر کے رائے قائم کرتا۔ ڈاکٹر کریم حیدر پبلک سروس کمیشن کی طرف سے آئے تھے، ان کے سوالات کبھی کبھی مبہم ہوتے اور مشکل بھی، اس پر ان کا بھاری بھر کم جثّہ، ایسی ہی آواز، کڑے تیور، اُمیدوار پر ہیبت سی طاری ہو جاتی، تھوڑی بہت ان ممبروں پر بھی جو بعض امیدواروں کی موافقت پر مائل ہوتے۔

ڈاکٹر حیدر کے بعد میری نشست تھی۔ لنچ کے بعد بورڈ کے ممبر اکٹھا ہوئے تو انٹرویو کا کام شروع کرنے سے پہلے فیلڈن نے ان امیدواروں پر تبادلۂ خیال کیا جو بورڈ کے سامنے آچکے تھے، گفتگو ختم ہونے پر آئی تو فیلڈن نے ڈاکٹر حیدر کو مخاطب کر کے کہا۔ ڈاکٹر حیدر دیکھو! اگر تم نے آئندہ اُمیدوارو ں کو ڈرانے دھمکانے کا ارادہ کیا تو میں بے تامل تم کو گولی مار دوں گا۔

ڈاکٹر حیدر نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ دونوں پاؤں اُٹھا کر کرسی پر پیچھے کی طرف لیٹ گئے، پھر مصافحہ کے لئے فیلڈن کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ڈاکٹر حیدر کے داد دینے کا یہی انداز تھا۔ اتنے میں بخاری نے آواز دی۔ صدّیقی صاحب! ادھر آبیٹھو، فیلڈن کے نشانے پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اب فیلڈن کا وہی حال تھا جو پروفیسر حیدر کا تھا۔

بڑے سے بڑے ذہنوں سے ٹکّر لینے اور محفل پر چھا جانے میں بخاری کا جواب نہ تھا، خواہ وہ محفلِ علم و دانش کے اکابر کی ہو خواہ بے تکلف احباب اور بے فکروں کی، خواہ سیاسی شاطروں کی۔ بات کوئی ہو، موقع کیسا ہی ہو بخاری نہ مشتعل ہوتے تھے، نہ مایوس، نہ متفکر، توازن اور تفنّن کی فضا برابر قائم رکھتے

تھے، کبھی برجستہ فقروں سے، کبھی اپنے مخصوص قہقہوں سے لیکن اس دوران میں مقصد کی طرف سے کبھی غافل نہ ہوتے اور جہاں تہاں ایسے نکتے پیدا کرتے رہتے کہ حریف کو قائل ہونا پڑتا کہ بخاری سے مفر نہیں مسئلہ زیرِبحث کتنا ہی نازک اور پیچیدہ کیوں نہ ہو بخاری اپنی بات بہت کچھ منوا لیتے تھے، کبھی ایک زیرک وکیل کی طرح، کبھی ایک کارآزمودہ جنرل کی مانند، حریفوں کو پسپا ہوتے ہی دیکھا، اکثر لاجواب ہو کر، کہیں ہنسی خوشی اور کہیں بے سوچے سمجھے بھی۔

یہ سماں ایک بار آل انڈیا ریڈیو دہلی میں دیکھا، جب بخاری اس کے ڈائرکٹر جنرل اور..... منسٹر انچارج تھے۔ جن کے بارے میں سب کو معلوم تھا کہ بخاری کے عاشقِ زار نہ تھے۔ اُردو ہندی کا جھگڑا بہت بڑھ گیا تھا آئے دن وزارت سے عتاب نامے اور ملک کے گوشے گوشے سے طرح طرح کے وفد نازل ہوتے رہتے، بخاری کو ان دونوں سے نپٹنا پڑتا مگر وہ مطلق فکرمند نہیں ہوتے تھے۔ وزارت کے عتاب ناموں کو تو "نامۂ اُلفت" کہا کرتے تھے اور وفود کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ ان کی نفسیات وہی تھی جس کا ذکر غالب نے اپنے اس مصرعے میں کیا ہے ؎

مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

ایسے وفود کا خیرمقدم وہ اس طرح کرتے جیسے اپنے بے تکلّف دوستوں یا عزیز طالب علموں کو چائے پر مدعو کیا ہو۔ ایک مرتبہ ایسا ہی ایک وفد باریاب ہوا، بخاری نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ موقع کی اہمیّت کا احساس کرتے اور دلاتے ہوئے ایک مختصر لیکن لاجواب انگریزی تقریر میں مہمانوں کا خیرمقدم کیا اور تقریر کو ختم کیا۔ چند خوشنما توصیفی فقروں پر جس کے مخاطب وہ بگڑے دل لیکن غبی اراکین تھے جن کو متعارف ہوتے وقت اُنھوں نے اپنی بے خطا زبانت

سے بھانپ لیا تھا۔ بخاری کی شیوا بیانی سے وفد ڈانواں ڈول ہوگیا اور ممبروں کے وہ کڑے اور کڑوے تیور مضمحل ہوگئے، جن کے ساتھ وہ غالب کے پُرزے اُڑانے آئے تھے۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی۔ اس کو ان سورماؤں نے پُورا کردیا جن پر بخاری کا جادو پہلے سے چل چکا تھا اور مباحثے کے دوران میں بخاری کی ناقابلِ بیان و ناقابلِ گرفت شہ پاکر، جس کے امام وقت تھے، اپنے ساتھیوں ہی سے بگڑنے اور ردو قدح کرنے لگے تھے۔

یہاں پہنچ کر بخاری نے پینترا بدل دیا اور ہمہ تن ان ممبروں کی تکریم و تواضع پر مائل ہو گئے جو یقیناً قابلِ لحاظ تھے لیکن اب تک ان کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ ان سے ملنے اور بات کرنے کا انداز بالکل مختلف تھا، بڑے عالمانہ انداز اور ماہرانہ سطح سے گفتگو شروع کی۔ اُردو اور ہندی کے مسئلے پر جتنی کتابی، اخباری، دفتری معلومات اور طرح طرح کے شمار و اعداد اور ان سے اخذ کیے ہوئے نتائج بخاری کے حافظے میں اور زبان پر تھے ان کے نصف مواد تک ممبروں کی رسائی نہ تھی۔ پھر ان کا سریع الانتقال کرشمۂ کار اور ناقابلِ تسخیر ذہن اور بات منوانے کے طرح طرح کے انداز بخاری کو کوئی نیچا نہیں دکھا سکتا تھا۔ میٹنگ میں ہر طرح کے "کیل کانٹے سے لیس" ہو کر آنے میں بخاری کے ہمسر کچھ ہی لوگ دیکھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اراکین بھی "زیرِ دام" آگئے اور بخاری نے "علیٰ قدرِ مراتب" کسی سے ہاتھ ملاکر، کسی کو گلے لگاکر، کسی کی شان میں دوچار نہایت مبالغہ آمیز فقرے کہہ کر، جو اتنے ہی مبالغہ انگیز بھی ہوتے، وفد کو ہنسی خوشی رخصت کردیا۔ علیٰ قدرِ مراتب کا ان کا اصول اور دوسرے کا المیہ یہ تھا کہ جس کو جتنا تہی مغز سمجھتے اتنا ہی زیادہ اس سے "سرگرمِ التفات" ہوتے اس سے حساب لگایا جاسکتا ہے کہ جس سے اُنھوں نے معانقہ کیا ہوگا۔ اس کا ان کے ہاں کیا درجہ رہا ہوگا۔

اس حربے سے بخاری ہی کام لے سکتے تھے۔ ان سے ذرا بھی کم درجے کا آدمی اس حربے کا خود شکار ہو جائے گا، یہ اس لئے کہتا ہوں کہ بخاری کے ترکش میں جتنے اور جس جس طرح کے تیر تھے موقع آجانے پر انتخاب جس تیزی اور تیقن سے کرتے اور جس مشاقی سے چلاتے وہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ ایسے تیر ہر ترکش میں نہیں ہوتے۔

آل انڈیا ریڈیو کی ڈائرکٹر جنرل شپ کے زمانے میں ایک ہندوستانی ڈکشنری کی تالیف میں مصروف ہو گئے تھے جس میں ملک کے بعض مخلص اور مستند اہلِ قلم ان کے شریک کار تھے، یہ کام انہی کی نگرانی میں ہوتا تھا، اس میں ان انگریزی الفاظ و اصطلاحات کے ہندوستانی مرادفات دیئے گئے تھے جو ریڈیو اور اخبارات وغیرہ میں رائج تھے، یہ کام اس زمانے میں جتنا ضروری تھا اتنا ہی نازک اور مشکل تھا اس لئے "ہندوستانی" کا لفظ یا تصوّر (جسے ہندی اُردو کا سنگم کہتے تھے) اُردو اور ہندی کے دونوں علمبرداروں کے یہاں نامعقول تھا۔ ڈکشنری کی کئی ضخیم جلدیں تھیں جو ٹائپ میں چھاپ لی گئی تھیں اور نظر ثانی کے لئے مختلف اصحاب کے پاس بھیجی جایا کرتی تھیں۔ تمام مترادفات اس ترتیب اور وضاحت سے علیحدہ علیحدہ خانوں میں دی گئی تھیں کہ تلاش کرنے والے کو انتخاب میں دقّت کا سامنا نہیں ہوتا تھا۔ تقسیمِ ملک کے بعد معلوم نہیں اس لغت کا کیا حشر ہوا، مکمل ہو جاتی تو ہندوستان اور پاکستان دونوں کے محکمہ نشر و اشاعت کے لئے بہت کارآمد اور بھلے مانسوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں بہت مفید ہوتی۔

انگریزی شعر و ادب پر ان کو جتنا غیر معمولی عبور تھا ہم سب جانتے ہیں لیکن ان کے ذوق و ذہانت کا پورا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم ان کے

اُردو مضامین میں انگریزی کی وہ جاندار، گوارا، نکھری ہوئی اور خوش آیند فضا محسوس کرتے ہیں۔ جو کسی اور کے یہاں نہیں ملتی۔ ان کے توسّل سے انگریزی کی جھلک اُردو میں دیکھ کر اُن کی اُردو شناسی اور انگریزی دانی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں خود اس کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں کہ غیر زبان کا اُردو میں ترجمہ اس طور پر کیا جائے کہ غیر زبان کی جنس کا پتہ نہ لگے۔

انگریزی موضوعات، مفاہیم اور اسالیب کو اُردو میں منتقل کرنے کا کام اوروں نے بھی کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں لیکن اس فرق کے ساتھ کہ دوسرے ایسا کرنے میں اکثر ترجمے، تفسیر یا مفہوم ادا کر دینے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ کبھی کبھی ادھ کچرے طور سے یا انگریزی کے مطالب کو اُردو کے روایتی شاعرانہ الفاظ یا بازاریں اس درجہ شرابور کر کے پیش کریں گے کہ نہ انگریزی ذہن کا صحیح طور پر اندازہ ہوگا نہ انگریزی زبان کا نہ انگریزی اسالیب کا اور نہ انگریزی فضا کا۔ بخاری کی اُردو کو میں ٹکسالی نہیں کہتا لیکن انگریزی کے پَرتو سے ان کی اُردو اس طرح جگمگاتی ہے جیسے ؎

پَرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

الہامی اور قانونی کتابوں کا ترجمہ سب سے مشکل ہوتا ہے اس کے بعد میرے نزدیک یورپین زبانوں کے ڈراموں کا ترجمہ مشکل ہے، جہاں فن، بیان و زبان اور نفسیاتی کیفیات کی بڑی نازک اور ناقابلِ گرفت وارداتوں کا سامنا ہوتا ہے، جس طرح سیسمو گراف (زلزلہ پیما) زمین کے چھوٹے بڑے ارتعاش مرتسم کر لیتا ہے، اسی طرح اچھا ڈراما سوسائٹی اور زندگی کے ارتعاشات کی نشان دہی کرتا ہے۔ بخاری نے انگریزی کے بعض مشہور ڈراموں کا جس خوبی سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انگریزی زبان اور انگریزی سوسائٹی کے

مزاج اور ڈرامے کی فنی نزاکتوں سے پورے طور پر واقف ہونے کے علاوہ اُردو کو نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کرانے کی کتنی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے، اُردو کا کوئی معمولی واقف کار غیر معمولی قرینے سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی ظرافت نگاری اور انگریزی ڈراموں کے تراجم دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بخاری نے اُردو کی ایک نئی جنبش اور ایک نئی توانائی کا انکشاف کیا ہو۔

جہاں تک مجھے علم ہے بخاری نے تنقیدی مضامین کم لکھے ہیں۔ لیکن اُردو کے ادبی تنقید نگاروں میں ان کا پایہ مسلم ہے اور یہ اس حقیقت کا مزید ثبوت ہے کہ بخاری نے بہت کم ادبی سرمایہ چھوڑا ہے لیکن بہتوں سے اونچا مقام پایا ہے۔ گزشتہ ۲۰۔ ۲۵ سال میں اُردو تنقید پر کافی توجہ کی گئی اور اب تو ادبی مذاکروں یا مجادلوں میں اس کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔ غزل کے بعد تنقید کے فن شریف پر ہمارے قبیلۂ شعر و ادب نے سب سے زیادہ طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن بحیثیتِ مجموعی کچھ اس طرح کا احساس ہوتا ہے جیسے تنقید نگار تنقید کے مقاصد کو نظر انداز کر کے اپنے مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوں، اور تنقید نہیں تبلیغ کرتے ہوں۔

اُردو میں جدید تنقید کا بیشتر سرمایہ مغربی ہے لیکن اسے جس شکل میں پیش کیا گیا ہے اس میں مغربی تنقید کی اتنی توضیح نہیں ملتی جتنا اس کا ترجمہ، ہمارے بعض تنقید نگاروں کو یہ بھی معلوم کرنے کی فکر نہیں ہوتی کہ مغربی تنقید کے کس اصول سے اُردو کے کس صنفِ ادب کو پرکھیں۔ نیز مغرب میں جن اصنافِ ادب پر تنقید ملتی ہے ادب کی وہ صنفیں اُردو میں ہیں بھی یا نہیں یا اُردو میں جو صنفِ ادب ملتی ہے اس کے لئے مغرب نے کوئی اصولِ تنقید وضع بھی کیا ہے یا نہیں، ادب کہیں کا ہو کسی طرح کا ہو۔ تنقید مغربی ہو گی۔ کیا کہا جائے سوائے اس کے کہ

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو۔

یہ بحث فرسودہ بھی ہے، تلخ بھی، شاید بے نتیجہ بھی، صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ بخاری اس حلقے میں شامل نہیں ہیں۔ ان کی تنقید وسیع ترین مفہوم میں خالص ادبی ہوتی تھی۔ اُنھوں نے جس مسئلہ پر یا شخص پر لکھا ہے اس کو اپنے نقطۂ نظر کا تابع نہیں کیا ہے بلکہ اس کے تمام پہلوؤں کا گہرا مطالعہ کر کے وہ وہ نقطۂ نظر دریافت کرنے کی کوشش کی ہے جو اس مسئلے یا شخص میں خوابیدہ یا موجود ہے۔ ادبی پارکھ کی ایک بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ کسی تخلیق یا شخصیت پر قلم اُٹھائے تو اس کا احاطہ اس طور پر کرے کہ جزو اور کلُ دونوں گرفت میں آجائیں، نہ یہ کہ جزو سے کلُ کی نشاندہی کرے اور کبھی کلُ سے جُزو کو روشناس کرائے۔ تصوّف میں یہ روا ہے، تنقید میں نہیں۔ ایسی تنقید یا پرکھ کے لئے ادب کی وسیع معلومات اور تنقید کے فنّی اصول سے گہری واقفیت کے علاوہ ایک بڑی شرط یہ ہے کہ تنقید نگار کی نظر میں وسعت اور دل میں کشادگی ہو۔

بخاری کی تنقید کا بڑا اچھا نمونہ ان کا مضمون "کچھ عصمت چغتائی کے بارے میں" ہے۔ عصمت چغتائی کی تحریریں منظرِ عام پر آئیں تو ادبی اور غیر ادبی دونوں حلقوں میں ایک شور "طوفان خیز" اُٹھا اور ان تحریروں کی ادبی قدر و قیمت کے بارے میں سخت اختلاف آرا ہوا۔ یہ اختلاف شدت پر تھا کہ بخاری کا یہ مضمون شائع ہوا۔ بخاری نے ایسا بے لاگ تجزیہ، اتنی گہری بصیرت کے ساتھ اس سنجیدگی سے کیا تھا کہ موافق اور مخالف دونوں مدھم پڑ گئے، البتہ یہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ خود عصمت چغتائی کے نقطۂ نظر پر اس کا کیا اثر پڑا۔

بخاری کا مزاج مغربی نہ تھا، ذہن تھا۔ ان میں اور ان کے بیشتر ساتھیوں میں اردو شعر و ادب کا ذوق، مشرقی تہذیب کا رکھ رکھاؤ اور طبائع کے اختلاف

کے باوجود اپنی قدروں کی بڑی پاسداری ملتی ہے۔ جب تک پطرس لاہور میں انگریزی کے پروفیسر رہے۔ ان کا اور ان کے رفقاء کا اُردو شعروادب کی سمت و رفتار پر برابر اچھا اثر پڑتا رہا۔ اِس زمانے میں "نیازمندانِ لاہور" کی آواز ایسی نہ تھی جس کو نظر انداز کرنا آسان ہوتا، نیازمندوں کے جامے میں بخاری کا اندازِ قد بے تکلّف پہچانا جا سکتا تھا، اپنی بیش بہا غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے بخاری لاہور کے تعلیم یافتہ، ذہین، ہونہار، نوجوان طبقے کے سرخیل تھے۔ اعلیٰ پائے کی ذہانتوں کا اتنا اچھا اور بڑا اجتماع اس زمانے میں شاید ہی کہیں اور دیکھنے میں آیا ہو۔ بخاری نہ ہوتے تو شاید ایسی مختلف النّوع، بے مثل ذہانتوں کا ایک مرکز پر جمع ہونا ممکن نہ ہوتا۔ کبھی کبھی یہ بات بھی ذہن میں آئی ہے کہ اگر بخاری ان رفیقوں کے ساتھ لاہور میں اسی طرح پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے ہوتے جیسے سرسیّد اور ان کے رفقا علی گڑھ میں، تو اُردو کی نئی فتوحات کا کیا عالم ہوتا!

یہ خیال اِس لئے ذہن میں آیا کہ تقسیمِ ملک کے بعد بخاری انگریزی کی پروفیسری پر لاہور واپس آگئے تو اُردو کو نئے حالات اور تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور قومی عزائم کے مطابق اس کی تنظیم و ترقی کا ایک منصوبہ ان کے ذہن میں تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ بخاری خود ڈاکٹر تاثیر اور خواجہ منظور حسین اور بعض دوسرے رفقاء یونیورسٹی میں اُردو کی اعلیٰ تعلیم کا کام اپنے ہاتھ میں لینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ کتنی حوصلہ انگیز، دوررس اور گراں قدر یہ اسکیم تھی، جو بروئے کار آجاتی تو کیا عجب آگے چل کر عثمانیہ یونیورسٹی مرحوم کا نعم البدل ثابت ہوتی، لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ بخاری کا دامن سیاسی کاموں نے بیرونِ ملک کھینچا اور ساتھیوں میں شاید کوئی ایسا نہ تھا جو اس منصوبے کی مشکلات اور نزاکتوں سے عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ دکھا اور ساتھی نوجوانوں کی قیادت کر سکتا۔

سوال یہ ہے کہ جہاں ذہنی صلاحیتوں کے اس کثرت سے اکابر موجود ہوں، علمی، قومی، تہذیبی کارناموں کی روایات کی فراوانی ہو اور قوم و ملک کی نئی تشکیل و تنظیم کے لئے ...... کار اور کارہ زار بھی کچھ کم نہ ہو۔ وہاں یہ بے عملی و بے حوصلگی کیسی، اس اجتماع کے افراد نے اپنے اپنے طور پر جا ہے جو کچھ اور جتنا کچھ کیا ہو اس سے انکار نہیں لیکن ایسی اور اتنی غیر معمولی قابلیتوں کا کوئی عہد آفرین کارنامہ سامنے نہ آیا۔ یہ بھی اپنی جگہ ایک المیہ نہیں تو مسئلہ فکریہ ضرور ہے۔

مغلیہ سلطنت کے زوال پر اہلِ فضل و کمال کا جیسا نادر روزگار اجتماع دہلی میں ہو گیا تھا اس کی مثال مسلمانوں کے عہد کے ہندوستان میں کہیں اور کم نظر آئے گی۔ جس کے بارے میں حالی نے کہا تھا ؎

مجھے ہنر مندا تنے تجھ میں جتنے گردوں پر نجوم

غدر میں یہ ستارے ٹوٹ کر بکھر گئے، ان میں سے سر سید نے اپنے رفقائے کرام کے ساتھ علی گڑھ میں ایک جدید شاہجہان آباد کی بنیاد رکھی اور علی گڑھ تحریک کے نام سے مسلمانوں کی حیاتِ نو کی طرح ڈالی۔

اس کے بعد اور پہلی جنگِ عظیم کے آس پاس کے زمانے میں علوم و فنون کے کتنے اور کیسے کیسے جامع کمالات، ہونہار نوجوان لاہور میں نظر آتے ہیں جن میں "جوانانِ سعادت مند" کے "پیر دانا" سر شیخ عبد القادر، مولانا ظفر علی خاں اور ڈاکٹر اقبال سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ اگر بعض وجوہ کی بنا پر مؤخر الذکر دو کو علیحدہ کر دیں تو شیخ عبد القادر یقیناً اِن لوگوں میں تھے جو پنجاب کے سر سید ہو سکتے تھے۔ جہاں تک ان کی رہ گی، شفقت اور سرپرستی کا تعلق ہے اُنھوں نے لاہور کے ہونہار نوجوانوں کے لئے کم سے کم اتنا ضرور کیا جو وہاں کے کسی اور سے نہ ہو سکا،

شیخ صاحب کے بعد سب سے زیادہ اس کی توقع بخاری سے تھی، وہی ان مرکز گریز اعلیٰ صلاحیتوں کو اپنے گرد جمع رکھ سکتے تھے۔ ایک حد تک انھوں نے رکھا بھی لیکن یہ شخصی تعلقات کی بنا پر تھا، کسی عظیم مقصد یا منظّم مقصد یا منظم اسکیم کے ماتحت جیسی کہ مثلاً علی گڑھ تحریک تھی، نہ تھا اور جس کے بغیر دور رس اور دیرپا نتائج نہیں پیدا ہو سکتے۔ آج بخاری کی یاد میں یہ بات ذہن میں آئی لیکن بے وقت نہیں آئی، اب بھی اس کا امکان ہے کہ لاہور کے بچے کھچے احباب ہونہار نوجوانوں کو اپنے سایۂ شفقت میں لے کر اس کام کو آگے بڑھائیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک نئے صحت مند، علمی، ادبی اور تہذیبی محاذ کی پاکستان کو بڑی ضرورت ہے۔

ہر سوسائٹی میں نوجوان بڑا غیر متیقن، بڑا خطرناک لیکن اتنا ہی قیمتی عنصر ہے، پاکستان کے نوجوانوں کو مناسب اور بروقت رہبری نہ ملی تو یہ زیادہ دنوں تک بے کار نہیں رہ سکتا۔ کسی اور سے ناطہ جوڑ لے گا۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ نوجوانوں کا فلاں یا فلاں مذہب ہے۔ در اصل وہ اپنے شباب کی وارداتوں (حوصلہ اور ہوس) کا شکار ہوتا ہے۔ مذہب تو اس کو صحیح اور صالح راستے پر لگانے والے دیتے ہیں۔

اسی حلقے "(نیاز مندانِ لاہور" یا نامورانِ لاہور) سے اس زمانے میں ایک بحث یہ اٹھائی گئی کہ پنجاب میں جو "میں نے جانا ہے" یا اس طرح کے اور فقرے بولے جاتے ہیں ان کو غلط کیوں قرار دیا جائے! پنجاب کے لوگ اُردو سے کچھ کم واقف نہیں ہیں۔ اُردو کی خدمت میں کسی سے پیچھے نہیں رہے، نثر اور نظم کی محفل میں ان کا درجہ کسی سے کم تر نہیں رہا۔ اُردو کا مستقبل بھی پنجاب ہی میں زیادہ روشن نظر آتا ہے، فارسی عربی کے علاوہ مغرب کی زبانوں اور

خزانوں سے بھی اُنھوں نے دوسروں کی طرح استفادہ کیا ہے۔ وغیرہ۔ اس لئے ان کی زبان پر یہ فقرہ جس شکل میں آتا ہے اس کو صحیح کیوں نہ مانا جائے!

کچھ دنوں یہ مسئلہ زیر بحث رہا لیکن جلد ہی ختم ہو گیا اور بات جیسے آئی گئی ہو گئی۔ اس موضوع پر ان سے اکثر گفتگو آئی۔ اتنی علمی و ادبی نہیں جتنی تفریحی۔ یو۔پی کی زبان، اشخاص یا شاعروں پر بخاری کو طبع آزمائی کا شوق ہوتا تو بے تکلف روئے سخن میری طرف کر دیتے۔ ایک بار بڑے مزے سے اور بہت زور دے کر کہنے لگے۔ پنجاب اس طرح کے فقرے اسی طرح بولے گا۔ آپ کے.... (نام حذف کرتا ہوں) جو چاہیں کر لیں۔ یہ جملہ غلط کیوں ہو، میں نے کہا "ہاں کیوں ہو"۔ کچھ مسکرائے، کچھ نرم پڑے، لیکن انداز کی برہمی قائم رکھتے ہوئے بولے۔ بتائیے نا آپ تو صرف و نحو میں خاصے مبتلا رہتے ہوں گے۔ اس میں قباحت کیا ہے؟ میں صرف و نحو سے قطعاً معصوم ہوں، آپ بھی ہوں تو ایسا کوئی سانحہ نہ ہو گا۔ لیکن چھوڑیئے ان باتوں کو، میں تو چاہوں گا کہ یہ فقرے اسی طرح بولے جائیں، اس میں ہزار عیب ہوں ایک خوبی بے مثل ہے۔ بولے "یعنی چہ"؟ عرض کیا "اس سے آدمی پہچان لیا جاتا ہے"۔ بے اختیار قہقہہ لگا کر کھڑے ہو گئے، بولے: صدیقی صاحب! میرے ساتھ چلئے۔ میں اس فقرے پر آپ کے اعزاز میں کھڑے کھڑے، پنجاب میں فرسٹ کلاس بلوا کرا سکتا ہوں۔

بخاری خطوط بڑے اچھے لکھتے تھے۔ ان کے کتنے اور کیسے دل آویز خط و خال ان خطوط میں جلوہ گر ملتے ہیں۔ اچھے خطوط وہی لکھ سکتا ہے جس کو مکتوب الیہ سے اخلاص اور اپنے پر اعتماد ہو۔ محبت کی سب سے معتبر علامت یہ ہے کہ عاشق اپنے راز محبوب پر ظاہر کرنے لگے۔ اچھے خطوط لکھنے کے لئے یہ رشتہ اتنا ضروری نہیں ہے جتنا اصول ضروری ہے۔ خط لکھنے کا وہ فن ہے جہاں تکلف یا تصنع لکھنے

والے کو لے ڈوبتا ہے "سیفٹی فرسٹ" یا سلف فرسٹ کے بندے کبھی اچھے خط لکھنے والے نہیں ہو سکتے۔ "آمیزشے کجا گہر پاک او کجا" کا اطلاق خطنگاری کے فن پر بھی ہوتا ہے۔

امریکہ یا کہیں اور سے دوستوں کے نام جو خطوط اُنھوں نے وقتاً فوقتاً لکھے اور اُردو کے رسالوں میں شائع ہوئے ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی معلومات کتنی وسیع اور جامع، مشاہدہ کتنا تیز، ذہن کتنا زرخیز، تاثرات کتنے گہرے، تخیّل کتنا نادرہ کار اور بات کہنے کے انداز میں کتنی شوخی، شیرینی اور تازگی تھی۔ وہ اپنی نجی تحریروں میں کبھی کبھی اپنے سے بھی زیادہ دلکش معلوم ہونے لگتے تھے، یہ فن اور شخصیت دونوں کا اعجاز ہے۔

بخاری کو اچھے سوٹ پہننے کا بڑا شوق تھا۔ ایک زمانے میں جب آل انڈیا ریڈیو کا پہلا دفتر علی پور روڈ پر تھا اور وہ اسٹیشن ڈائریکٹر یا اس سے اونچے کسی منصب پر تھے۔ ان کا درزی کشمیری دروازے کے آس پاس کہیں رہتا تھا دکان اور مرجوعہ دیکھتے ہوئے کچھ ایسا ماہرِ فن نہیں معلوم ہوتا تھا، لیکن بخاری اس پر فریفتہ تھے۔ اس کے پاس کبھی تقاضے کے لئے، کبھی سوٹ میں ترمیم و اصلاح کی غرض سے، اس پابندی اور شغف سے آتے تھے۔ جیسے بعض مصنّفین اپنی کتاب کا مسودہ دیکھنے بھالنے کاتب کے گھر یا پریس کا چکّر لگاتے رہتے ہیں۔ اس مہم پر ایک بار میں بھی ساتھ تھا۔ دکان پر پہنچے تو وعدہ خلافی پر درزی سے کچھ دیر مصروفِ داسوختت خوانی رہے۔ کپڑے کی قطع برید، استر سلائی، کاج بٹن کے بارے میں ایسے ایسے نکتے درزی کے ذہن نشین کرانے لگے ضمناً میرے بھی کہ میں حیران رہ گیا کہ اچھا خاصا آدمی کس چکّر میں مبتلا ہے۔ شاید اس بات کو سمجھ گئے۔ دفعتاً بولے "کیوں صدیقی صاحب آپ کو سوٹ سے بھی دلچسپی ہے!" عرض کیا "کیوں

نہیں، لیکن مردوں کے نہیں، عورتوں کے سوٹ سے۔"

بخاری ہنس پڑے لیکن فقرے کی داد درزی سے دلوائی یہ کہہ کر کہ صاحب کو سلام کرو صاحب عورتوں کا سوٹ پسند کرتے ہیں۔ سلام تو اُس نے کیا لیکن جیسے اسے اس کا یقین نہ ہو کہ اس پسند کا اظہار میں نئے سوٹ میں ملبوس کسی خاتون سے کرنے کی کبھی جرأت کی ہو گی، مدتوں بعد تقسیمِ ملک سے پہلے مرکز میں کانگریس اور مسلم لیگ کی مخلوط وزارت بنی تو ایک دفعہ دفتر میں ملاقات ہوئی۔ سر سے پاؤں تک کسی اعلیٰ النسل کے کھدر کے سوٹ میں ملبوس تھے، دیکھ کر ہم دونوں بیک وقت مسکرائے لیکن ستم یہ تھا کہ بخاری کا مسکرانا میرے مسکرانے پر بھاری پڑ رہا تھا۔

ایک بار میں نے خط لکھا کچھ روپے بھیج دیجئے کارِ خیر کے لیے درکار ہیں خط ملتے ہی روپے بھیج دیئے، توقع سے زائد، میں نے شکریہ کے خط میں لکھا بخاری صاحب میری طرح بچپن میں آپ نے بھی مجتبائی قسم کی کتاب میں کہیں نہ کہیں ضرور پڑھا ہو گا کہ ایک مسافر کھانا کھا رہا تھا، اتفاق سے کوئی کتا بھوک سے نڈھال پہنچ گیا، مسافر نے ایک ہڈی اس کے آگے پھینک دی کچھ دنوں بعد کسی نے مسافر کو خواب میں دیکھا جس نے بتایا کہ مرنے کے بعد قبر میں عذاب کے فرشتے نازل ہوئے اور گرز مارنا چاہتے تو کتے کو دی ہوئی ہڈی سامنے آجاتی اور فرشتے کچھ نہ کر پاتے۔ چنانچہ عذاب واپس لیا گیا۔ مجھے یقین ہے جو رقم آپ آپ نے اس کارِ خیر میں بھیجی ہے وہ آپ کے اب تک کے گناہوں کے لئے ایسی ہی ثابت ہو گی۔ بخاری نے لکھا "مژدے کا شکریہ، لیکن اس کا بھی تو اندیشہ ہے کہ ہم آپ جب آخرت میں پہنچیں تو شرحِ مبادلۂ زر" اتنا خاطر خواہ نہ رہے۔"

.....تفصیل یا یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا محسوس اکثر کیا کہ اس حلقے کے افراد جتنے بخاری کے شیدائی تھے، بخاری اُن کے نہ تھے، وہ یقیناً اُن کو بہت

عزیز رکھتے تھے لیکن مقررہ خانوں میں ان پر کسی طرح کی ارضی یا سماوی آفت نازل ہو جاتی ہو گی تو مجھے یقین ہے بخاری ان کی مدد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے ہوں گے، روپے پیسے سے، دوڑ دھوپ سے، تحریر و تقریر سے، لیکن شاید وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ذہانت، علمیت، اقتدار اور شہرت کے میدان میں جہاں وہ لاشریک نہ تھے ان کا کوئی ساتھی یا کوئی اور شرک کا مرتکب ہو۔

بخاری بڑے بت شکن تھے۔ جینیس کا تقاضا بھی یہی ہے لیکن جہاں وہ خداؤں میں صرف مسلمانوں کے خدا کے قائل تھے وہاں بتوں میں صرف اپنے بت کے۔

اقوام متحدہ کے دفتر میں بخاری شبانہ روز اپنے فرائض جس جانفشانی اور قابلیت سے انجام دیتے تھے، وہاں کے چھوٹے بڑے اہل کار کو جس طرح اپنا قائل اور گرویدہ رکھتے تھے اور یارانِ باصفا سے ملنا ہو جاتا تھا تو محبت اور بے تکلفی سے پیش آتے تھے۔ اس کا حال ملاقاتیوں سے معلوم ہوتا رہتا جو ان کی زیرکی اور ذکاوت کے واقعات اس مزے سے بیان کرتے تھے جیسے کوئی افسانہ سنا رہے ہوں۔ کچھ عرصہ سے ان کی صحت تیزی سے گرتی جا رہی تھی جس کے سبب سے خاموش اور دل گرفتہ رہنے لگے تھے۔ اس کے باوجود جیسے کبھی کبھی "بادِ شمال" کا گزر ہو جاتا اور افسردہ کلیاں مہکنے مسکرانے لگتیں کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر، دوستوں کو جمع کر کے سیر کو نکل جاتے، ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور ہنس بول کر وقت گزار لیتے جو ان کا ہمیشہ سے محبوب مشغلہ تھا۔ پی۔ ای۔ این کی جے پور کانفرنس کے بعد فاسٹر علی گڑھ آئے تھے۔ فاسٹر بالطبع کم سخن ہیں، چہرے سے علم کا وقار اور عارف کی گہری سوچ نمایاں رہتی ہے۔ چائے پر ایک شام اچھا خاصا اجتماع ہو گیا۔ کہنے لگے ہندوستان آتا ہوں تو ایک بات کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ کتنے اچھے اور ذہین لوگ جن کو یونیورسٹیوں میں ہونا چاہیئے یا ادب کی

خدمت کرنا چاہیئے، کتنی جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔ بات کچھ آگے بڑھی تو بولے تم لوگ بخاری کو (جو اس زمانے میں ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل تھے) اپنی یونیورسٹی میں کیوں نہیں مقیّد کر لیتے، موقع ملتا تو میں اُن کو کیمبرج میں گرفتار کر لیتا۔ پھر دبی زبان اور غمگین مسکراہٹ سے یہ بھی کہا کہ وہ وہاں سے دیوار پھاند کر نکل جاتے تو میں کیا کر لیتا۔

آج یہ گفتگو یوں یاد آرہی ہے کہ بخاری نے اپنا آخری پروگرام یہ بنایا تھا کہ اقوامِ متحدہ کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر امریکہ کی کسی یونیورسٹی سے منسلک ہو جائیں گے۔ لیکن اسے کیا کہیئے کہ کسی یونیورسٹی کی دیوار میں مقیّد ہونے اور پھاندنے سے پہلے ہی وہ زندانِ حیات ہی کی دیوار پھاند گئے۔

"پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) ہم سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گئے ان کی باتوں اور تحریروں سے بے شمار لوگوں کے دل خوش ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے اتنی بڑی خدمت لی تو یقیناً ان کو اپنی بیکراں نوازش سے سرفراز بھی فرمایا ہوگا۔"

کُندَن

کندن مرگیا اور گھنٹے بجتے رہے!

کندن کالج کا گھنٹہ بجاتا تھا۔ معلوم نہیں کب سے، کم و بیش ۳۰-۲۵ سال سے، اتنے دنوں سے اس پابندی سے کہ اس طرف خیال کا جانا بھی بند ہو گیا تھا کہ وہ مرجائے گا یا گھنٹہ بجانے سے باز آجائے گا! طالبِ علمی کا زمانہ ختم کر کے اسٹاف میں آیا تو یہ گھنٹہ بجارہا تھا۔ اسی کے گھنٹوں کے مطابق کام کرتے کرتے پوری مدّت ملازمت ختم کی، یونیورسٹی سے رخصت ہوا تو اسے گھنٹے بجاتے چھوڑا، گھنٹے کی آواز روزمرّہ کے اوقات میں اس طرح گھل مل گئی تھی جیسے وہ کہیں باہر سے نہیں میرے ہی اندر سے آرہی ہو، جیسے وہ وظائفِ جسمانی کے ان معمولات میں داخل ہو گئی ہو جن کا شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا!

کئی دن بعد کسی نے بتایا، کندن مرگیا۔ ایک دھچکا سا لگا۔ ارے کندن مرگیا۔ اتنے دنوں سے گھنٹے کی آواز آتی رہی اور حسبِ معمول یہی سمجھتا رہا کہ کندن بجارہا ہے۔ بتائے بغیر کیوں نہ معلوم ہو گیا کہ کندن مرگیا! ناوانستگی میں اس کی یاد کے ساتھ یہ کیسا قصور ہوا! پھر وہی بات ذہن میں آئی جو ہمیشہ ہر ذہن

ہیں آئی ہے کہ موت سے مخصوص افراد چاہے جس شدت سے متاثر ہوں نظامِ فطرت میں اس سے زیادہ ناقابلِ التفات واقعہ دوسرا نہیں۔ اس سے فطرت کے نظام میں کوئی خلل پڑتا ہے نہ دنیا کے طور طریقوں میں فرق آتا ہے۔ اس احساس سے تسکین تو کیا ہوتی بے چارگی اور بیزاری کے احساس میں اضافہ ہو گیا۔ کیسے نہ کہوں کہ افراد کا متاثر نہ ہونا نظامِ فطرت کے متاثر ہونے نہ ہونے سے بڑا حادثہ ہے۔ انسان کی جس نہج پر ترکیب ہوئی ہے اس میں تو افراد ہی کے تاثرات سب کچھ ہیں۔ باقی "تمام شعبدہ ہائے طلسمِ بے سببی!"

کندن کے گھنٹہ بجانے پر ٹھدی منزل سے لے کر مشتاق منزل تک کی کلاسیں باہر آجاتیں۔ ترکی ٹوپی، سیاہ ترکش کوٹ اور پتلون نما سفید پاجاموں میں ملبوس ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے شریف، امیر غریب گھرانوں کے خوب رو، خوش اطوار ہنستے بولتے نوجوان اسی طرح برآمد ہوتے جیسے بقولِ انشاؔ "ہوا کھانے کو نکلے ہیں جوانانِ چمن"۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک کتنے خاندانوں کی اُمیدوں اور اُمنگوں کا چمن کھلا ہوا نظر آتا۔ دو تین منٹ تک یہ ہمہمہ رہتا، پھر یہی لڑکے کلاس میں جا بیٹھتے۔ مقررہ وقفے کے بعد کندن گھنٹہ بجاتا، وہی سماں پھر نظروں کے سامنے آجاتا۔ پڑھائی کے دنوں میں صبح سے سہ پہر تک یہی سلسلہ جاری رہتا۔ آتے جاتے پوچھ لیتا۔ کندن کون سا گھنٹہ چل رہا ہے؟ اتنا گھنٹہ دریافت کرنے کے لئے نہیں، جتنا اس سے ملنے کی تقریب منانے کے لئے، ہمیشہ جواب دیتا، حجور فلاں گھنٹہ۔ چاہے پوچھنے والا طالب علم ہو، معلم ہو یا کلرک۔ اس کے حجور کہنے میں توقیر اور تواضع کی حلاوت تھی، خوشامد یا تصنع کی گراوٹ نہیں!

موت اور زیست کی گردش نے کتنوں کو بڑا کتنوں کو چھوٹا کتنوں کو یکساں

کردیا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے، موت سے زیادہ ہم سطح کر دینے والی دوسری کوئی شے نہیں۔ اس ۳۰، ۳۵ سال میں ہم سے قریب، ہم سے دور، ہمارے لائے ہوئے کیسے کیسے انقلابات برپا ہوئے۔ نوجوانوں کی کتنی نسلیں اس ادارے سے نکلیں اور زندگی کے چھوٹے بڑے محاربوں میں فتح و شکست سے کس کس طرح دوچار ہوئیں یا ہیں۔ ان سب کو کیسے اور کہاں تک یاد ہیں سمیٹوں، یہ سب ہونا رہا لیکن کندن کا گھنٹہ بجانا جوں کا توں رہا۔ جیسے اس کا گھنٹہ بجانا یونیورسٹی کے موجود اور معتبر ہونے کا اعلان تھا۔ لیکن ہوا وہی جو بالآخر ہو کر رہتا ہے۔ کندن مر گیا۔ تقدیر کے اس معمول میں فرق نہ آیا۔ "زندہ ہیچو توئی یا زفسق ہیچو منی!" اگر یہ ہے اور ہے بھی یہی تو یہ جنگ نامساوی طاقتوں کی ہے جس میں فتح ہمیشہ کمزور کی مانی جائے گی!

یونیورسٹی کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ مرزا اختر حسین صاحب اسسٹنٹ رجسٹرار تھے جن کے سپرد امتحان کا کام تھا۔ کندن کو انھوں نے اپنا آنریری سیکنڈ لفٹیننٹ اور کواڈرینگل (کچی پکی بارک) کے سارے مہتروں کا کمپنی کمانڈر مقرر کیا اور کھچیرا (ایک بڈھا مہتر) کو لانس کارپورل LANCE CORPORAL خواص میں یہ کمپنی MIRZA AKHTAR HUSAIN ON FUSSILIERS (مرزا اختر حسین اون فوسیلیرس) کے لقب سے اور عوام میں کندن کی سفر مینا کے نام سے مشہور ہوئی، امتحان کے زمانے میں شروع سے آخر تک یونیورسٹی میں مرزا صاحب کندن اور یہ سفر مینا پلٹن ایک دوسرے سے جدا یا دور نہیں دیکھی گئی!

مرزا صاحب ہر کام ضابطے اور اہتمام سے کرنے کے شائق تھے۔ اس زمانے میں امیدوار کم ہوتے تھے جن کے لئے اسٹریچی ہال کافی بڑا ہال تھا لیکن

موصوف اس دھوم سے امتحانات منعقد کرتے جیسے نہ صرف امیدوار بلکہ ان کے والدین اور قریبی رشتہ دار سب کے شریک ہوجانے کا امکان تھا۔ اسٹریچی ہال کے سامنے سے اس زمانے میں گزرتے تو اس کے اونچے برآمدے کے صدر دروازے پر مرزا صاحب کھڑے کمانڈ کرتے ہوئے کوٹ کی اوپری جیب میں رنگ برنگ کی پنسلیں اس ترتیب سے نظر آتیں جیسے ملٹری کا کوئی امتیازی ربن لگا ہوا ہے۔ کسی پنسل کو جگہ نہ ملی تو لبوں میں دبا رکھتے، ہاتھ میں رنگین کھریا کے ایک آدھ ٹکڑے، بغل میں طرح طرح کی فائلیں اور کاغذ کے پلندے۔ ڈسک یا کرسی پر یا فائلوں میں جس قسم کی ضرورت دیکھی کھریا سے نشان لگا دیئے یا پنسل سے نوٹ لکھ دیئے۔ زینے پر کندن اس سے نیچے سڑک پر مہتروں کی سفر مینا "جاروب بدست و کھرپا در بغل" اٹینشن کھڑی ہوتی۔ کچھ اسی طرح کا نقشہ ہوتا جیسا آج کل قومی جھنڈے کو سلامی دینے کے لئے نیتا کھڑا ہوا اور دوسرے حسب مراتب نیچے صف آرا ہوں۔ مرزا صاحب کا حکم پاتے ہی کمپنی کمانڈر کندن، سفر مینا کے ایک حصے کو ساتھ لے اسٹریچی ہال میں نشستیں ترتیب دینے میں مصروف ہوجاتا، ڈیٹچ منٹ اہم پوزیشنوں پر جھاڑو دینے لگتا یا گھاس کھودنے لگتا!

یہ زمانہ مالی مشکلات کا تھا، یونیورسٹی سے تنخواہ پانے والے معلموں کو پرچہ بنانے یا امتحان کی کاپیوں کے جانچنے کا معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ اس کی تلافی مرزا صاحب نے کچھ اس طور پر کی تھی کہ جو لوگ نگرانی کے کام پر مامور ہوں لمونیڈ اور برف ان کی خدمت میں مفت پیش کی جائے۔ اس کا حساب کندن رکھتا تھا۔ اور مرزا صاحب ان اخراجات کی ادائگی امتحان فنڈ سے کرتے تھے۔ ایک دن آفس پہنچا تو دیکھا کہ مرزا صاحب کندن پر گرج رہے ہیں۔ قصہ یہ تھا کہ ایک صاحب نے

نگرانی کے دوران میں ڈیڑھ درجن بوتلیں اور اسی حساب سے برف پی ڈالی تھی۔ مرزا صاحب کندن پر بگڑ رہے تھے کہ تو نے یہ صورتِ حال دیکھی تو مجھے کیوں نہ اطلاع کی، اس طرح تو امتحان فنڈ کا دیوالہ نکل جائے گا، مرزا صاحب کے حضور میں کندن کسی قدر شوخ تھا۔ کہنے لگا، حضور اطلاع کرتا تو پہلے صاحب کے گھر والوں کو کرتا آپ کو کرنے سے کیا فائدہ! مرزا صاحب نے فوراً اس دو حرف پر بھی سُرخ پنسل سے نشان لگا کر بل پاس کر دیا لیکن آئندہ کے لئے یہ رعایت ہمیشہ کے لئے اُٹھالی! چو از قومے یکے بے دانشی کرد!

مرزا صاحب نے اندرونی ممتحنوں کے لئے ایک رعایت اور رکھی تھی۔ ہر سال امتحان کی پرانی کاپیوں سے سادے اوراق نکال کر نئی کاپیاں بنائی جاتی تھیں، ہم میں سے جو لوگ مرزا صاحب کے صحیفۂ خوشنودی میں کوئی ممتاز مقام رکھتے تھے اور موصوف کو یقین دلا چکے ہوتے کہ ہم کو لکھنے پڑھنے کا کام دوسروں سے زیادہ کرنا پڑتا ہے، ان کا موصوف نے منصب یا وثیقہ مقرر کر دیا تھا۔ جیسے مغلوں کے پنج ہزاری یا سہ ہزاری منصب دار یا نوابانِ اودھ کے ہاں وثیقہ دار ہوتے تھے، اُسی طرح مرزا صاحب کے ہاں پنج سیری سے لے کر آدھ سیری تک کے منصب دار ہوتے تھے، یعنی ان کو ہر سال اتنے ہی سیر یا آدھ سیر امتحانوں کی کاپیوں سے نکالے ہوئے سادے اوراق دیئے جاتے تھے۔ بعض اس کو مرزا صاحب کے جلوسِ شاہی کا یومِ تقریب دوسرے اس کو فصل کی تیاری اور بٹائی کا زمانہ قرار دیتے تھے۔

یہ منصب داری یا وثیقہ یابی عظمت الہٰی زبیری کے عہدِ رجسٹراری تک برقرار رہی، اس کے بعد یہ قصہ ختم ہو گیا۔ کندن کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ یہ اوراق تول کر بنڈل باندھتا اور ہمارے گھروں پر پہنچا دیتا اور ہم سب

کی توفیق کے مطابق انعام پاتا۔ کندن یہ بنڈل لے کر آتا تو میں پوچھ لیتا "کیوں کندن مرزا صاحب کے حضوری ہماری کارگزاری میں کوئی فرق تو نہیں آیا۔ تول ٹھیک ہے؟" کہتا "ہجور بالکل ٹھیک ہے، کھاتر جمع رکھیں۔" ایک دن کندن کی عملداری میں گزرا۔ نئی کاپیوں کے لئے پرانی کاپیاں پھاڑی جارہی تھیں، پوچھا "کندن ہمارے وثیقے کا کیا ہوا؟" بولا "ہجور اب نبابی (نوابی) نہیں رہی، دوسری عملداری ہے!" میں نے کہا "کوئی بات نہیں، تم تو اپنا وثیقہ وصول کرنے کے لئے نوابی زمانے والوں کے پاس آہی جایا کرو!"

کچھ دنوں بعد مرزا صاحب رجسٹرار ہو کر پٹنے چلے گئے اور امتحانات کے لئے، جہاں تک سیٹیں فراہم کرنے اور ان کو ترتیب دینے کا سوال تھا، کندن کو پورے اختیارات مل گئے۔ امتحانات سے آگے بڑھ کر سرکاری اور غیر سرکاری تقریبوں میں نشستوں کے انتظام کا فریضہ بھی رفتہ رفتہ کندن کے حصے میں آگیا۔ اختیارات کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ کہیں سے کسی کو تفویض کئے جاتے ہیں، بعض لوگ جوڑ توڑ سے حاصل کرتے ہیں، کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بزمِ مے میں کوتاہ دستی کے قائل نہیں ہوتے بلکہ خود بڑھ کر ہاتھ میں اٹھا لیتے ہیں تو مینا انھیں کا ہوجاتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں ایسے اشخاص بھی ملتے ہیں جن کی طرف اختیارات خود کھنچے چلے جاتے ہیں جیسے پانی نشیب کی طرف مائل ہوتا ہے، ان ہی میں سے ایک کندن تھا! تقریب کہیں کیسی ہو، وقت کم ہو، مہمانوں کے بیٹھنے کا سامان فراہم کرنے میں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ حائل ہوں، گزشتہ ۳۰، ۴۰ سال سے یہ مہم کندن اس خوبی سے انجام دیتا تھا کہ سب حیران رہ جاتے۔

مسلم یونیورسٹی میں یوں بھی طرح طرح کی جتنی چھوٹی بڑی صاف ستھری تقریبیں "صلائے عام" کے اصول پر منعقد ہوتی رہتی ہیں میرا خیال ہے ہندوستان میں شاید ہی کہیں اور اتنے سے مختصر رقبے اور آبادی میں جتنی کی یونیورسٹی کی ہے، ہوتی ہوں۔ یہ اچھا ہے یا بُرا اس بحث سے قطع نظر واقعہ وہی ہے جو بیان کیا گیا۔ ان تقریبوں سے خوبی کا خرابی کا غالباً وہ تقاضا یا توازن نیم شعوری طور پر پورا کر لیا جاتا ہے جو بڑے بڑے شہروں مثلاً دہلی کلکتہ بمبئی وغیرہ کا امتیاز یا آشوب سمجھا جاتا ہے! یونیورسٹی کے بڑے عہدہ داروں کی ایک اہم صفت اور اُن کی ثبات وصحت وحواس کا قوی ثبوت ایک یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک ہفتہ تک یونیورسٹی کے کھانے پینے کی ساری تقریبوں میں جہاں وہ بالضرور مدعو ہوتے ہیں خورد و نوش کے ساتھ شرکت کی اور اپنے معالج سے سرخرو رہے!

کسی شعبے یا شعبے کے کسی کمرے میں کتنے ڈسک اور کرسیاں ہیں کس حالت میں ہیں، کتنی ٹوٹ پھوٹ میں آگئیں، اس کے بدلے میں کتنی اور آئیں، اس کی خبر جتنی کندن کو تھی، خود شعبے کے چپراسی کو نہ تھی۔ امتحان کا کاروبار پہلے کی نسبت بہت بڑھ گیا ہے۔ فرنیچر کی، وقت کی تنگی، کمروں کی کمی۔ ان سب سے نپٹنے کے لئے کندن کی ایک "شخصی وزارت" کا مشورہ اور مدد لازمی تھی۔ کندن ہی بتا سکتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ کتنی نشستوں کا کہاں کہاں کس طرح انتظام ہو سکتا ہے۔ امتحان قریب ہوتا تو ہر شعبہ کے صدر کے نام رجسٹرار آفس سے ایک گشتی مراسلہ آجاتا کہ امتحان کے لئے زیادہ سے زیادہ کرسیاں اور ڈسک مہیا کئے جا سکیں، شکر گزاری کے موجب ہوں گے، یہ خط لے کر کندن جاتا۔ پوچھتا، کندن کیسے کدھر آنکلے؟ بجو امتحان ہے نہ، کرسی ڈسک

چاہئیں، بھئی یہ ہمیشہ کا دھندا ہے اس میں ایسا پوچھنا کیا' میاں خاں (شعبے کا چپراسی)، اور تم آپس میں سمجھ لو۔ کندن سامان اُٹھوا کر لے جاتا۔ امتحان کے ختم ہونے پر ہر کرسی اور ڈسک اسی کمرے میں اسی قرینے سے رکھی ہوئی مل جاتی جس طرح لے جائی گئی تھی۔

شعبہ کے فرنیچر پر نام اور نمبر کا اندراج بہت بعد کی چیز ہے' اس سے پہلے ان پر پہچان کا کوئی نشان نہ ہوتا۔ لیکن کندن کے پہچان اور اٹکل کو کیا کہئے کہ ہزاروں میز کرسیوں کو پہچانتا تھا کہ ان کا گھر کہاں ہے کس خاندان کی ہیں' ان کو وہیں پہنچا دیتا۔ فرنیچر کے گھرانوں (شعبہ جات جن کی امانت اور نگہداشت میں وہ فرنیچر تھے) میں کسی کو کبھی اس کی شکایت نہیں ہوئی کہ کسی یاترا یا میلے میں اس کا کوئی عزیز غائب ہو گیا یا کسی کو اغوا کر لیا گیا۔

کنووکیشن (جلسہ تقسیم اسناد) کی تقریب عام طور سے ساڑھے گیارہ بجے سے شروع ہو کر ڈیڑھ پونے دو بجے ختم ہوتی ہے۔ اسی پنڈال میں تقریباً اتنے ہی اشخاص کے لئے عصر میں چائے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کنووکیشن کا جلسہ جس نوعیت کا ہوتا ہے جس طریقے سے جیسی گنجان نشستوں کا انتظام کیا جاتا ہے' چائے کے لئے اس سے بالکل مختلف ترتیب لازم آتی ہے۔ جلسے میں چھوٹی میزوں کی ضرورت نہیں ہوتی، چائے کے لئے ہوتی ہے۔ پھر ہر میز کے گرد چار یا چھ مہمانوں کے بیٹھنے کے لئے انتظام۔ تین گھنٹے کے اندر اندر اس طرح کی صدہا میزوں کا لگانا اور سجانا اور صبح کی ترتیب کو یکلخت بدل دینا آسان کام نہیں ہے۔ دوپہر کے جلسے میں جو حضرات شریک ہوئے تھے، سہ پہر کو چائے پر آئے تو دیکھا کہ سارا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے، جیسے صبح کا جلسہ کہیں اور نہیں تو کسی اور دن ہوا تھا۔ اِسی پنڈال میں رات کو مشاعرہ ہونے

والا تھا۔ بیٹھنے کا انتظام پھر بدلا جائے گا، جیسے دیتے ہوں دھوکا یہ بازیگر کھلا! رات گئے تک "یہ ہنگامۂ شعر و سخن" برپا رہے گا۔ دوسرے دن کندن اور کمپنی تمام میز کرسیاں حسبِ معمول اپنی اپنی جگہ پر پہنچا دیں گے!

جلالۃ الملک شاہ سعود اور اعلیٰ حضرت شاہ ایران کے مختلف اوقات میں دو کی تقریبیں لوگوں کو یاد ہوں گی۔ چھ سات ہزار نشستوں کا انتظام اس میدان میں کیا گیا تھا جس میں اب یونیورسٹی لائبریری کی نئی عالی شان عمارت کھڑی ہے، یہیں ان کو اعزازی ڈگریاں دی گئی تھیں۔ سہ پہر کی چائے کا انتظام ایک دفعہ کرکٹ دوسری بار سوئمنگ باتھ لانس پر کیا گیا تھا، دونوں تقریبوں میں حسبِ معمول مشکل سے تین گھنٹے کا فصل تھا۔ پنڈال کا تقریباً تمام فرنیچر اتنے ہی عرصہ میں منتقل کر کے پلان کے مطابق ترتیب دینا کندن اور اس کے رفقار کا کام تھا۔

اس کے بعد اتنی بڑی پارٹی کو سجانے اور کھانے پینے کی اشیا کو حسبِ منشا میزوں پر چن دینا دوسرے کندنوں کا کام تھا۔ انھوں نے اِن پارٹیوں کا انتظام حسبِ معمول اس خوش اسلوبی سے کیا جیسے معلوم نہیں کتنی دیر پہلے سے وہ اس اہتمام میں مصروف تھے، اور معلوم نہیں کیسے اور کہاں اُنھوں نے اس فن میں دستگاہ پیدا کی تھی۔ علی گڑھ میں ہر فن مولانا نہیں تو ہر فن مولا مل جائیں گے جو اپنی اپنی دادی کے مسلّمہ طور پر امام مانے جاتے ہیں اور کام کتنا ہی دشوار اور بڑا کیوں نہ ہو اس کو اس خوش اسلوبی سے اتنا جلد انجام دیں جیسے ان کے پاس جادو کی کوئی چھڑی ہو یا مُوکل قبضے میں ہو۔

یونیورسٹی میں نجی تقریبیں بھی چھوٹے بڑے پیمانے پر ہوا کرتی ہیں۔ نشستوں کے لئے میز کرسی کی فراہمی کا انتظام کندن کے سپرد ہوتا تھا۔ بڑے سے بڑے

پیمانے پر جتنی جلدی اور جس خوبی سے وہ یہ سب انتظام کر دیتا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا فرنیچر صحیح و سالم اپنی اپنی جگہ پر واپس پہنچا دیتا وہ صرف اسی کے بس کی بات تھی چیخ پکار نہ دوڑ دھوپ، نہ تو تکار، کام اس طرح انجام پاتا جیسے کام کیا نہیں جا رہا ہے بلکہ خود ہوتا جا رہا ہے، جیسے دن رات کا تواتر۔ ساتھی کام کرنے والوں کا جتنا پکّا تعاون کندن کو نصیب تھا کم دیکھنے میں آیا۔ کبھی بعض ممبرانِ اسٹاف کو کہیں سے فرنیچر منگانے یا ملنے میں نزاکتوں کا سامنا ہوتا، یہ مرحلہ کندن بڑی آسانی سے طے کر لیتا۔ اس کا کسی شعبہ میں جا کر محض یہ کہہ دینا کافی ہوتا تھا کہ فلاں صاحب کے ہاں فلاں تقریب ہے، فرنیچر چاہیئے! اس کے کہنے کو کوئی نہیں ٹالتا تھا۔ حجت یا ٹال مٹول تو اس سے کی جاتی جس کے ہاں تقریب تھی لیکن مانگنے والا تو کندن تھا۔ وہ ہر ایک کی خدمت کر چکا تھا۔ اس کی کون نہ مانتا۔

میرا خیال ہے کندن شاید اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا کہ ٹوٹے پھوٹے ہندی رسم خط میں کچھ ہندسے یا ایک آدھ عبارت نوٹ کر لیتا ہو لیکن اس کی اٹکل اور قوتِ حافظہ غیر معمولی تھی۔ اپنے کاموں کے علاوہ مدتوں وہ امتحان کے دفتر میں بہت سے کام انجام دیتا رہا۔ اس دفتر میں کام کرنے کی ذمہ داری ہر شخص کے سپرد نہیں کی جا سکتی تا وقتیکہ اس پر کامل بھروسہ نہ ہو۔ کندن کی ایمانداری اور راست بازی ہر شخص کے نزدیک اتنی مسلّم اور مستحکم تھی کہ امتحان کے دفتری کام ہی کا نہیں دوسرے سرکاری نیم سرکاری اور پرائیویٹ کام بے تکلف سپرد کر دیئے جاتے تھے۔ کندن کے بیان پر کوئی جرح نہیں کرتا تھا۔ وہ جو کہہ دیتا لوگ مان لیتے۔ دفتر نے ایک بار نئی سرکاری بائیسکل

پر اسے بینک یا سنٹرل پوسٹ آفس کسی ضروری کام سے بھیجا۔ کندن نے آکر بتایا کہ سائیکل کوئی اُٹھا لے گیا۔ اس کی اطلاع تو احتیاطاً پولیس کو کر دی گئی لیکن یونیورسٹی میں کسی نے کندن سے سوال جواب نہیں کیا۔ یہ بات مان لی گئی کہ سائیکل چوری ہو گئی، اور بس!

امتحان کی کاپیوں کا ایک بنڈل کسی ممتحن کے پتے پر باہر بھیجا گیا کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ ممتحن کو وہ پارسل نہیں ملا۔ وہاں کے ریلوے کے دفتر سے پوچھا گیا تو جواب آیا کہ پارسل سرے سے وصول ہی نہیں ہوا، یہ بہت بڑا اسٹیشن تھا، جہاں کے گودام میں پارسلوں کی ایسی کثرت ہوتی ہے کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہو جائے تو کسی خاص پارسل تک رسائی ناممکن ہو جاتی ہے۔

اس مہم پر کندن کو مامور کیا گیا۔ اس نے جا کر اسٹیشن پر ادھر ادھر دریافت کیا۔ بابوؤں نے جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے کبھی انکار کیا، کبھی ٹالنا چاہا، بالآخر کندن نے وہ تیور اور لہجہ اختیار کیا جو کبھی کبھی بہ درجۂ مجبوری وہ یہاں اپنی سفر مینا کے بعض ممبروں سے اختیار کرتا تھا اور کہا کہ پارسل گھر میں لے چلو میں خود تلاش کر لوں گا۔ یہ آفر یا چیلنج اُن کو قبول کرنا پڑا۔ اس نے جا کر پارسلوں کے جنگل میں سے اپنا پارسل پہچان کر نکال لیا۔ امتحان کا زمانہ تھا، امتحان ہی کے طرح طرح کے بے شمار دوسرے پارسلوں کے علاوہ یکساں رنگ کے معلوم نہیں کتنے اور پارسل کہاں کہاں سے آئے ہوئے تلے اوپر گڈمڈ رکھے ہوں گے، ان میں سے کندن کا اپنے پارسل کو دریافت کر لینا کتنے اچنبے کی بات ہے!

۱۹۴۷ء کی قیامت برپا تھی۔ علی گڑھ کے نواح میں قتل و غارت گری کی جیسی ہوش ربا خبریں آتی تھیں اور ہر طرف مایوسی اور درماندگی کا جو عالم تھا

اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس زمانے میں یہاں تھے۔ کندن کا مکان دودھ پور میں تھا۔ جو یونیورسٹی سے ملا ہوا ایک مختصر سے گاؤں کی شکل میں اس سڑک کے ہر دو طرف آباد ہے، جو یونیورسٹی فارم کو چلی گئی ہے۔ یونیورسٹی کھلی ہوتی تو تقریباً ہر روز کندن سے دوچار ہونے کا اتفاق ہو جاتا۔ پوچھتا کہو کندن کب تک یہ خون خرابا رہے گا، گاؤں میں کیا خبر ہے؟ کندن سر جھکا لیتا جیسے ندامت اور رنج کے بوجھ سے دبا جا رہا ہو۔ کہتا حضور کالج پر سید صاحب کی دعا ہے، سب کھیریت رہے گی، کالج کا بڑا نمک کھایا ہے، پرمیشر لاج رکھ لے! اس زمانے میں میں نے کندن سے زیادہ مضطرب یونیورسٹی میں کسی اور ہندو کو نہ پایا، جیسے واقعی وہ اپنے آپ کو "سید صاحب" کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہو۔

اس زمانے میں یونیورسٹی کے ایک مسلمان گھرانے کے بچّے دہلی کے ایک ایسے محلے میں گھر گئے جہاں حادثے وقوع میں آرہے تھے، نہ کوئی جا سکتا نہ وہاں سے کوئی باہر نکل سکتا تھا۔ کسی طرح کی مدد کہیں سے پہنچانے کی سبیل نہیں نکلتی تھی۔ علی گڑھ میں خاندان والے جس بے قراری کے عالم میں تھے، وہ بیان سے باہر ہے۔ اِس واقعے کا علم کُندن کو ہوا تو اس نے بے تکلف اپنی خدمات پیش کر دیں۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ اس مہم میں خود کی جان کا خطرہ کچھ کم نہ تھا۔ لیکن اس نے اس پر بالکل دھیان نہیں دیا۔ اتا پتا دریافت کیا اور بے محابا دلی کی آگ میں کود پڑا۔ سب کو نکالا اور بہ حفاظت تمام علی گڑھ لا کر ان کے گھر پہنچا دیا۔ کیسے کیسے خطرات کا کس دلیری اور عقل مندی سے کہاں کہاں اس نے مقابلہ کیا اس کا ذکر اس نے خود کبھی نہیں کیا لیکن جن کو چھڑا لایا تھا، وہ بتاتے تھے کہ کندن پر کب کیا گزری۔

کندن نے اس یونیورسٹی میں اپنے تمام چھوٹے بڑے ہم مذہبوں کی طرف سے یہ خدمت ایسی انجام دی ہے جس کو بھلایا نہیں جاسکتا اور وہ لوگ تو خاص طور پر نہیں بھول سکتے جن پر وہ زمانہ گزرا ہے۔ بڑے آدمی چھوٹی بات کر کے بھی بڑے بنے رہتے ہیں چھوٹا آدمی بڑے کام کر کے بھی چھوٹا ہی رہ جاتا ہے۔ اسے کیا کہئے یا کیا کہہ کر کوئی کیا کرے گا!

عرصے بعد حالات کچھ راہ پر آئے تو ایک دن یونیورسٹی میں یہ صدا سُنائی دی کہ قلندروں نے کندن کو دودھ پور کا راج پرمکھ قرار دے دیا پوچھا کیوں کُندن چُپکے چُپکے راج پرمکھ بن گئے، خبر نہ کی۔ بولا، حضور، یہ لڑکے ہیں نا جب چاہیں خود راج پرمکھ بن جائیں، جب چاہیں دوسرے کو بنا دیں۔ ان کا کیا؟

اسٹریچی ہال کے دائیں بائیں زینے دار دو راستے ہیں جن کے سروں پر عالی شان کھلے محرابی دروازے ہیں جن سے سید محمود اور سرسید کورٹ میں آمد و رفت رہتی ہے۔ ان راستوں سے متوازی آمنے سامنے سہ دریاں ہیں جن کے پہلو میں ایک ایک کوٹھڑی ہے۔ ان میں سے ایک کندن کے قبضے میں تھی۔ معلوم نہیں کب سے، 'یونیورسٹی کھلی ہو' ادھر سے گزرے تو کندن اکثر سہ دری میں بیٹھا۔ بیڑی پیتا یا کسی سے بات کرتا ملتا۔ اسٹاف کا کوئی ممبر ہو، یا آفسوں کا کوئی عہدہ دار، دیکھ کر فوراً کھڑا ہو جاتا، سلام کرتا، مزاج پوچھتا کبھی کبھی یہ بھی پوچھ لیتا کہ کوئی خدمت ہو تو وہ بجا لانے پر تیار رہتا۔ جب تک دروازے سے گزر نہ جائیں کھڑا رہتا۔ تکریم کے خیال سے بھی اور شاید ذمّہ داری کے اس تقاضے کے بنا پر بھی جس کا ممکن ہے نیم شعوری طور پر حساس ہو کہ اس کی عملداری سے آپ خیریت سے خوش خوش گزر جائیں!

عمر ستر کے لگ بھگ رہی ہوگی شکل سے پچاس سے زیادہ کا معلوم نہیں ہوتا تھا کبھی کبھی اس طرح کا احساس بھی ہوا جیسے کندن کی عمر ایک خاص حد پر آکر ٹھہر سی گئی ہو۔ کم سے کم مجھے اس کے قویٰ شکل وصورت اور رفتار وگفتار میں عرصے سے نمایاں تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔ ممکن ہے جسے روز دیکھتے اور عزیز رکھتے ہوں وہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہو!

درمیانہ قد، گندمی رنگ، پتلا نقشہ، معمولی جثہ، مضبوط جسم، گھنٹے ہی کی طرح بجتی ہوئی پائیدار آواز، چہرہ بشرہ شریفانہ اور مردانہ کس بلا کا مستعد اور محنتی یہ شخص تھا نہ دن دیکھتا نہ رات، نہ سردی نہ گرمی نہ بارش۔ کبھی کوئی کہتا، کندن بوڑھا ہوا اتنی محنت نہ کیا کر تو وہی کلمہ دُہرا دیتا جو اس کا تکیہ کلام سا بن گیا تھا یعنی ہجور کالج کا نمک کھایا ہے پرمیشر نباہ دے!"

یونیورسٹی کی دی ہوئی وردی خاکی یا بھورے رنگ کا کوٹ، کبھی پاجامہ، کبھی دھوتی پہنے اپنی عملداری میں، وکٹوریا گیٹ سے لے کر بابِ اسحٰق تک گشت لگاتا رہتا۔ آج وہ فضا اُن لوگوں کو کتنی سونی اور سوگوار معلوم ہوتی ہوگی جنہوں نے ۳۰، ۳۵ سال تک مسلسل کندن کو کام کرتے اور اس نواح میں چلتے پھرتے دیکھا تھا اور اس کی موجودگی کو یونیورسٹی کے اہم اور غیر منقطع معمولات سے تعبیر کرنے کے عادی ہو چکے تھے!

ایک دن میں نے کہا کندن تم اپنے اس بارہ ماسی یونیفارم (بھورے کوٹ) میں خاص طور سے جب اپنی پلٹن کے ساتھ کام پر ہوتے ہو تو نپولین جیسے معلوم ہوتے ہو۔ نپولین کو جانتے ہو کون تھا۔ بولا میں جاہل کیا جانوں۔ میں نے کہا ہسٹری ڈیپارٹمنٹ تمہارے سائے میں بسا ہوا ہے کسی دن وہاں پوچھ آنا! ایک زمانے میں کالے کوسوں دُور ولایت میں تمہاری ہی طرح وہ بھی گھنٹے بجاتا رہتا اور کلاس

کے طالب علموں کی طرح وہاں کے لوگ اور وہاں کی راجدھانیاں اُلٹ پلٹ ہوتی رہتیں!

آخر زمانے میں کندن نے اپنے لئے ایک اور اچھا سا گھر بنوانا شروع کر دیا تھا۔ کالج کا نمک کھانے کا، ایک تصرّف یہ بھی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص چاہے وہ منصب یا دولت کے اعتبار سے چھوٹا ہو یا بڑا تقریب منانے، تعلیم دلانے اور مکان بنانے کا منصوبہ بڑے ہی پیمانے پر باندھتا ہے۔ ستم یہ ہے کہ اپنا ہی نہیں دوسرے کا کام بھی اسی پیمانے پر کرنے کرانے یا دیکھنے کا جی چاہتا ہے۔ اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے لیکن اب تک اس "حرکت" سے کسی کو باز آتے نہیں دیکھا گیا!

کندن کی نظر اور نگرانی میں سرسیّد کی بنائی ہوئی عمارتیں رہیں۔ اسٹریچی ہال کا وہ تنہا تمام عمر کلید بردار رہا، یہ مضبوط شاندار تاریخی عمارتیں اس کے ذہن و دماغ پر مستولی تھیں، زندگی بھر وہ انہی عمارتوں میں بیدار رہا۔ کالج کی تمام تقریبوں کی بساط وہی بچھاتا۔ ظاہر ہے ان عوامل کا اثر اس کے فکر و عمل پر کیسا پڑا ہوگا۔ "کالج کا نمک کھانے" کا ایک اور اثر بھی ہے، سب اثروں سے زیادہ کاری اور خطرناک جو کندن کیا وقت پر سبھی بھول جاتے ہیں یا خاطر میں نہیں لاتے، وہ یہ کہ جتنا بڑا منصوبہ ذہن میں آتا ہے اس کو پورا کرنے کے وسائل اتنے ہی محدود ہوتے ہیں! کندن بھی اسی تقدیر کا شکار ہوا!

تعمیر کے اخراجات، آمدنی کی رفتار اور مقدار سے دن بدن تیزی سے بڑھنے لگے۔ اسی اعتبار سے فکر اور پریشانی میں اضافہ ہوا۔ اس کے قریب جو لوگ تھے۔ ان کا بیان ہے کہ اس تعمیر کے چکّر میں کندن ادھ مُوا ہو گیا تھا۔ اقربا کی

بے مہری اور سخت گیری نے بقیہ کمی بھی پوری کر دی۔ ایسے میں ایسا ضرور ہوتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے نا قابلِ تسخیر کندن نے کہاں پہنچ کر شکست قبول کی شاید کندن کو بچایا جا سکتا تھا!

کندن کے بارے میں جیسے خیالات ذہن میں آئے اور جس طرح کے جذبات اُمڈے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس طرح کر سکتے ہیں کہ اس کی جن باتوں سے اور مدّت العمر کی غیر منقطع وفا شعاری اور فرض شناسی سے جو تاثرات ایک نارمل شخص کے دل پر بے اختیار طاری ہو جائے ان کو رد کیا جا سکتا ہے یا اُن سے روگردانی کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں کی جا سکتی تو آج یا کل دنیا کا چاہے جیسا رنگ ڈھنگ ہو، کندن کی یاد تازہ رہے گی۔ ہم میں بہت سے ایسے ہوں گے، بالخصوص نو وارد جو اس سے واقف نہ ہوں گے، تو خیر گھنٹہ بجانے والا ایک معمولی شخص تھا۔ یہ ادارہ اب اتنا پھیل گیا ہے اور پھیلتا جا رہا ہے کہ خود اسٹاف کے بہت سے اراکین آج یا کل ایک دوسرے سے واقف نہ ہو پائیں گے۔ اس صورتِ حال پر ماتم کرنا ثواب کا کام نہیں ہے لیکن اس کو کیا کیجئے کہ جب تک ہم "گزشتہ سے پیوستہ" میں گزشتہ کا ذکرِ خیر ایک ایسی روایت ہے (اور یہی ایسی روایت ہے) جو نہ اب تک بدلی ہے نہ کبھی بدلے گی۔

آج کی دنیا میں یہ بات خاص طور پر دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ اتنی دیر تک نئی نہیں رہتی جتنی جلد پُرانی ہو جاتی ہے۔ یہ سائنس کے نت نئے انکشافات اور ایجادات کا کرشمہ ہے۔ پُرانی دنیا میں زیادہ دیر تک پُرانی بنے رہنے کی صلاحیت تھی، پُرانی دنیا کی یہ بات قابلِ فخر ہے یا نئی دنیا کی وہ' اس پر یہاں کون بحث کرے۔ قابلِ لحاظ اور قابلِ فخر تو وہ شخصیتیں ہیں جو نئی پرانی کی قید سے آزاد ہوتی ہیں، ایسی ہی ایک شخصیت کندن کی تھی۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق

بابائے اُردو (عبدالحق) نے ۲۶، اگست ۱۹۶۱ء کو کراچی میں ۹۱ سال کی عمر پاکر رحلت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کی بے لوث و بے نظیر خدمات کو ہماری موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے اچھے اور بڑے مقاصد کے حصول میں اُمید اور اُمنگ کا لازوال سرچشمہ بنائے۔

موت سے کسی کو مفر نہیں لیکن جو لوگ اعلیٰ مقاصد کی تائید و حصول میں تادمِ آخر کام کرتے رہتے ہیں، وہ کتنی ہی طویل عمر کیوں نہ پائیں، ان کی وفات قبل از وقت اور تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے۔ پہلی صورت طبعی اور ارضی ہے، دوسری اخلاقی اور ماورائی۔ تقدیرِ الٰہی نے صرف نوعِ انسان کو مؤخرالذکر اقدار کے تحفّظ و ترفع کے لئے انتخاب کیا ہے۔ مولوی صاحب کی زندگی اور وفات دونوں میں اس کی تعبیر ملے گی۔

مولوی صاحب ۱۸۸۸ء میں علی گڑھ کے طالبِ علم ہوئے اور ۱۸۹۶ء میں یہیں سے بی اے کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب غدر کے بعد سر سیّد ہندی مسلمانوں کی معاشی، ذہنی و تہذیبی آباد کاری کے منصوبے کو کامیاب بنانے میں اپنے عقیدے

اور عمل کی پوری توانائی و تابناکی کے ساتھ علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ کے عظیم ادارے کے وسیلے سے اس عہد کی نوع بہ نوع دشواریوں اور نزاکتوں سے نبرد آزما تھے۔ اس تحریک اور ادارے کو مستحکم و مؤثر بنانے اور فروغ دینے میں دُور اور نزدیک کے عام و خاص مسلم، ہندو، سکھ، یورپین نیز مدرسۃ العلوم کے اساتذہ اور طلبا جس میں ہر ملّت و مسلک کے پیرو شامل تھے، یکساں طور پر نہایت تندہی و خلوص کے ساتھ سر سیّد کے شریکِ کار تھے۔ حالات کے یکسر منقلب ہو جانے کے باوجود ادارے کا یہ امتیاز آج تک باقی ہے۔ اس وسیع پیمانے پر اتنی مدّت تک ہندوستان کے شاید ہی کسی اور ادارے کو اتنی بے لوث و ہمہ جہت تائید ملی ہو اور جس نے اس فراخ دلی و جُرات سے اپنی ذمّہ داری پوری ہو۔

عنفوانِ شباب کی بے پایاں اور بسا اوقات تند صلاحیتوں کی تربیت و تہذیب اور ان کو صحیح راستے پر لانے اور رکھنے کے لئے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ مولوی صاحب بڑے خوش قسمت تھے کہ ان سر سیّد کا سایہ اور سہارا اور ان کے نادرۂ روزگار رفقائے کرام کی صحبتیں نصیب ہوئیں ان کو سر سیّد سے بڑا رہنما، مدرسۃ العلوم سے بہتر ادارہ اور علی گڑھ تحریک سے زیادہ مفید مقتضائے وقت اور جامع پروگرام اور کہاں مل سکتا تھا۔ ان کی غیر معمولی ذہنی استعداد، ثابت قدمی، اور کام کرنے کی لگن کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ علی گڑھ میں اتنی معقول اور مؤثر نظری و عملی رہبری نہ میسر آتی تو کیا معلوم وہ کدھر نکل جاتے اور جتنے کارہائے عظیم جتنی طویل مدّت تک اُنھوں نے جس خوبی سے انجام دیئے وہ دے بھی سکتے یا نہیں! یہ اس لئے کہنا پڑا کہ آج کل بیشتر ذی استعداد اور ہونہار نوجوانوں کو مناسب و معقول رہبری اور ماحول نہ ملنے سے بے راہ روی نے دنیا کو جس انتشار، مایوسی اور بیزاری سے دوچار کر رکھا ہے، وہ ہمارے سامنے ہے، جس کو دُور کرنے

میں ہماری بہترین مساعی اب تک ناکام رہی ہیں، خدا نہ کرے یہ سرکشی و گمراہی اپنا تاوان لئے بغیر نہ رہے جیسا کہ تاریخ بتاتی چلی آرہی ہے جس کے آثار روز بروز نمایاں ہو رہے ہیں۔

جس طرح غدر سے پہلے دہلی میں دین و دانش تہذیب و شائستگی علم و فن کے اتنے ہنرور جمع ہو گئے تھے جتنے گردوں پر نجوم، اسی طرح اس کے بعد جیسے مردانِ کار شستہ دماغ اور ملک و ملت کے خیر اندیش سرسید کی قیادت میں اکٹھا ہوئے، اس کی بھی مثال ہندوستان میں کہیں اور مشکل سے ملے گی۔ دہلی کے جتنے اربابِ کمال غدر میں ادھر اُدھر ہوئے ان میں سے کسی نے کہیں جاہ و اقتدار کا سکہ چلایا، کہیں رشد و ہدایت اور خیر و برکت کے آستانے قائم ہوئے، کہیں اربابِ کسب و ہنر نے اپنا اپنا کاروبار سنبھالا اس طرح سارے ملک میں فن اور فضائل کے ستارے روشن ہو گئے۔

سرسید نے علی گڑھ سے ایک نئے اُفق کا ظہور، ایک نئی زندگی کے افتتاح اور ایک نئے چیلنج کے قبول کرنے کا اعلان کیا، چنانچہ اُنھوں نے، ان کے رفقا نے اور ان کے بعد آنے والوں نے زندگی اور زمانے کے ہر نئے تقاضے سے نبرد آزما ہونے اور "گزشتہ سے پیوستہ" اور آئندہ سے ہمدوش و ہمعناں رہنے کی روایت قائم کی جس طرح اچھا استعارہ ہم کو بے اختیار غالب اور اقبال کے یہاں سے دستیاب ہوتا ہے اسی طرح نیا مقصد، نئی منزل اور نئے حوصلے کی نشان وہی علی گڑھ میں اور علی گڑھ سے ملتی ہے!

مولوی صاحب علی گڑھ کے غیر معمولی ذہین طلبا میں بھی ممتاز اور اپنے ساتھیوں اور اساتذہ دونوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ وہ اپنے دور کے برخود غلط یا سرپھرے، طلبا میں نہ تھے۔ اس زمانے میں کالج کے نظم و نسق پر اعتراض یا

احتجاج کرنا اتنا آسان، تفریحی یا سود مند مشغلہ نہ تھا جتنا کہ اب ہے لیکن مولوی صاحب جس بات کو نامناسب سمجھتے اس پر اختلاف کا اظہار ضرور کرتے تھے۔ ان کی اس صفت پر سر سیّد اعتماد کرتے اور مولوی صاحب نے برملا وصاف گوئی ہی نہیں اچھے کام کرنے کی دُھن، خطرہ وخسارہ، مایوسی و بیزاری اور طعن اغیار کو خاطر میں نہ لانے کا سبق بھی سر سید ہی کی گرامی ذات و زندگی سے سیکھا تھا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: "سر سید کی بڑی تمنا تھی کہ مدرستہ العلوم کے طلبا، ہمّت، جرأت اور شریفانہ اخلاق سے متصف ہوں۔ اور جب کسی طالب علم سے اخلاقی جرأت یا خود داری کا فعل صادر ہوتا تو بہت خوش ہوتے، اُنھوں نے طبیعت کی اس افتاد کو نہ صرف بحیثیت طالب علم کالج کے انگریز ممبرانِ اسٹاف کے مقابلے میں برقرار رکھا بلکہ حیدر آباد دکن کی فضا میں بھی ترک نہیں کیا جہاں مدّتوں "وظیفہ خوار" کی حیثیت سے وہ مطلق العنان حکمران، اسی طرح کے امرائے دولت اور ان دونوں سے زیادہ طاقت ور و خطرناک جماعت، انگریز حکام سے قریب رہے۔ ایسے عہد میں مولوی صاحب کا نہ کبھی "شاہ کو دعا دینا" نہ ریاست کے اعیان و اکابر کا ثنا خواں ہونا معمولی بات نہیں ہے!

مولوی صاحب کو شروع سے آخر تک وقت کے گرانمایہ شخصیتوں کی صحبت و رفاقت نصیب رہی۔ مدرستہ العلوم میں سر سیّد، محمود، شبلی، حالی، محسن الملک، وقار الملک، پروفیسر بک، پروفیسر ماریسن، پروفیسر آرنلڈ، حیدر آباد میں افسر الملک، سید علی بلگرامی، نواب عماد الملک، مہاراجہ کشن پرشاد، عزیز مرزا، علی حیدر طباطبائی، عنایت اللہ، ظفر علی خاں، وحید الدین سلیم، سر اکبر حیدری، سر راس مسعود، ان کے علاوہ خواجہ غلام الثقلین، ڈاکٹر اقبال، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، عبد الرحمٰن صدیقی (سندھی) وغیرہ یہ ایسی ہستیاں تھیں جنھوں نے ہمارے قدیم

کی اعلیٰ روایات و اقدار کو جدید کے اہم تقاضوں سے روشناس کرانے اور سازگار بنانے میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اس سے ہماری علم دوستی، تہذیب و شائستگی، فرض شناسی، محنت کوشی، ایمان داری اور دلیری کے کارنامے روشن ہیں۔ اُنھوں نے ایک نازک اور پُر آشوب زمانے میں قدیم کا اعتبار و وقار جدید کی تاخت و تاراج میں محفوظ بھی رکھا اور روشن بھی۔ قدیم و جدید کو ایک دوسرے کی روش و روشنی میں دیکھنا اور پرکھنا اور ان کی خوبیوں کو قبول اور خرابیوں کو ترک کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے، یہ صرف خاصانِ عصر کر سکتے ہیں۔

اس بات کا ذکر اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہم یا تو پُرانے کو فی الفور اور یک قلم ترک کر کے نئے کو قبول کر لیتے ہیں یا نئے کو کسی بھی قیمت پر اپنانے کو تیار نہیں ہوتے۔ اور ستم ظریفی یہ کہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ یہ طریقہ تقاضائے فطرت اور آئین فطرت اور آئینۂ زندگی دونوں کے منافی ہے۔ اس سے انسانی ترقی و تہذیب میں نہ ربط باقی رہتا ہے نہ تسلسل اور انسانی معاشرے میں بڑا انتشار و اختلال واقع ہوتا ہے۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد تلاشِ ملازمت میں مولوی صاحب کو بمبئی جانا پڑا جہاں وہ براہِ راست محسن الملک کی غیر معمولی شخصیت کے زیرِ اثر آئے جن کے بارے میں وہ خود فرماتے ہیں "ان میں پارس پتھر کی خاصیت تھی کہ کوئی ہو کہیں کا ہو اُن سے چھُوا نہیں اور کندن کا ہوا نہیں!"

یہاں کرنل افسر الملک بہادر کی نظرِ انتخاب مولوی صاحب پر پڑی جن کو وہ اپنے ہمراہ حیدرآباد دکن لائے اور مدرسۂ آصفیہ کا صدر مقرر کر دیا۔ ۱۸۹۸ء میں یہیں سے مولوی صاحب نے رسالہ "افسر" کا اجراء کیا۔ اسی وقت

سے اُردو اور مولوی صاحب نے ایک دوسرے کی تقدیر پہچانی اور اپنائی مولوی صاحب نے عمر کا بیشتر غالباً بہترین زمانہ حیدر آباد میں اُردو کی عملی تعلیمی و تصنیفی سرگرمیوں میں گزارا۔ انجمن ترقیٔ اردو کو جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک معطّل ورنہ مضمحل جُز تھی سنہ ۱۹۱۲ء میں علی گڑھ سے دکن کی سرزمین پر لائے اور آنریری سیکریٹری کی حیثیت سے یکہ وتنہا اس کو اتنی ترقی دی کہ وہ اُردو کی بے شمار اعلیٰ صلاحیتوں کا آئینہ، اُن کو بروئے کار لانے کا وسیلہ اور اُردو کی حفاظت وحمایت کا معتبر کل ہند محاذ بن گئی۔

قدیم اُردو کا گہوارہ ہونے کی حیثیت سے دکن کو جو اہمیت حاصل ہے وہ مسلّم ہے لیکن یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ دکن کی اس اہمیت کو ترقی دینے اور فعال بنانے میں مولوی صاحب کی بیش قرار خدمات کو بہت بڑا دخل ہے۔ اُنھوں نے دکن کو اپنی گوناگوں علمی سرگرمیوں کا مرکز نہ بنایا ہوتا تو نہ صرف یہ کہ اُردو کی تاریخ وتحقیقات کا کام اتنا ترقی نہ کرتا بلکہ دکن کو شاید وہ بے مثل فضیلت بھی نصیب نہ ہوتی۔ یعنی دکن میں دیسی زبان (اُردو) کی ایک یونیورسٹی قائم ہوئی جو اتنی مختصر مدت میں ہندوستان کی معیاری انگریزی اور سرکاری یونیورسٹیوں کی ہم پلّہ ہوگئی، جس کی تصدیق کرنے والوں میں آج بھی سر رادھاکرشنن اور شری راجگوپال آچاری موجود ہیں، اردو کی اس رہنمائی سے ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں کی تقدیر روشن ہوگئی۔ دکن میں قدیم اُردو کی تصانیف کا سراغ لگاکر مولوی صاحب نے اُردو کے ماضی میں تقریباً ۲۰۰ سال کا اس کے حال میں ایک معیاری یونیورسٹی اور اس کے مستقبل میں اردو تہذیبی تسخیر کے امکانات کا بڑا پائدار، بیش قرار اور بے نظیر اضافہ کیا۔

اس میں شک نہیں جدید علوم وفنون کی اعلیٰ تعلیم اُردو زبان میں دینے کا

کامیاب تجربہ پہلے پہل دہلی کالج میں ہوا اور یونیورسٹی کا خیال سب سے پہلے سرسیّد کو آیا جنھوں نے ۱۸۸۶ء میں برٹش ایسوسی ایشن کی طرف سے جس کے وہ بانی اور آنریری لائف سیکرٹری تھے، اس بارے میں ایک عرض داشت گورنمنٹ آف انڈیا میں پیش کی جسے وزیر ہند نے بھی پسند کیا لیکن اس وقت حالات کچھ ایسے تھے کہ یہ تجویز عمل میں نہ آسکی۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے بانیوں میں مولوی صاحب، سر اکبر حیدری اور سر راس مسعود سب سے زیادہ ممتاز اور پیش پیش تھے، لیکن اس کو مستحکم کرنے اور رکھنے کے لئے جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا گیا مولوی صاحب نے جس دور اندیشی، قابلیت اور محنت سے اُردو قواعد، وضع اصطلاحات، تحقیق وتدقیق، تالیف وترجمے، تنقید ولغت کے کاموں کا جدید معیار کے مطابق آغاز کیا اور ترقی دی وہ انھیں کا کارنامہ ہے، جس کے بغیر یہ بے مثل اور عظیم الشان تجربہ کامیاب نہ ہوتا مولوی صاحب کی ان گراں قدر خدمات سے اُردو کی اہمیت مسلم ہوئی اور اس کی ترقی کے امکانات تیزی سے برگ وبار لانے لگے۔ ان خدمات کے طفیل اُردو کی اوّلین یونیورسٹی ہندوستان میں قائم ہوئی۔ ایسے بڑے کام میں تنہا ایک شخص کی علمی وادبی خدمات اور مسلسل جدوجہد کا شاید اتنا گراں قدر نمونہ کہیں اور نظر آئے! جہاں تک اُردو زبان کے جاننے، پرکھنے اور ہر سطح اور نوعیت کے کاموں میں مفید ومستند اضافے کا تعلق مولوی صاحب کا ثانی کوئی نہیں۔ اُردو کے بارے میں سرسیّد نے جو خواب دیکھا اس کی تعبیر مولوی صاحب کی خدمات میں ملتی ہے۔

کسی زبان کے مکمّل ومقبول ہونے کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کی معیاری یونیورسٹی ہو۔ تقسیم سے پہلے کا ہندوستان جتنی اور جن مدارج کی دیسی زبانوں اور بولیوں پر مشتمل تھا اور آج بھی ہے اس کی مثال کہیں اور کم ملے گی۔ ان میں

سب سے کم عمر لیکن اپنی ترکیب، ظہور و نفوذ کے اعتبار سے سب سے عجیب، سب کی حلیف اور بہتوں کی نمائندہ اُردو ہے، اس میں کام کرنے والے، اس سے کام لینے والے اور اس سے نام پانے والے ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی سب ہی ہیں۔ لیکن پچھلے کم و بیش سو سال سے اس کو جس مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، جو اب مخاصمت کی حد تک پہنچ گئی ہے، وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ مولوی صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اُردو کی سرشت اور اس کی شخصیت کو واضح و متعین کیا اور ہر طرف سے مُنہ موڑ کر ہر انعام و دشنام سے بے نیاز ہو کر اُردو کی حفاظت و حمایت کی وہ بھی اس طریقے سے جو سب کے بس کا نہ تھا، یعنی اُردو کے سرمائے میں اپنے گرانقدر مضامین و مقالات کے اضافے سے ایہ ستم دیدنی ہے کہ اُردو کی دوستی میں اپنے اور پرائے دونوں کی دشمنی بھی مولوی صاحب کے حصے میں سب سے زیادہ آئی۔ اُردو کا ایسا محسن و مجاہد جس نے ہر خطرے و رسوائی، اور ہر لذّت و الم سے مُنہ موڑ کر تمام عمر قلمے، قدمے، سخنے، درمے، ہر سطح سے، ہر محاذ پر صرف اُردو کی خدمت کی ہو اور جس کی خدمات سے اُردو اتنی ممتاز و معتبر ہوئی جتنی مولوی عبدالحق کی خدمات سے، اُردو کی تاریخ میں نہ ملے گا، شاید کسی اور ادب کی تاریخ میں بھی نہ ملے!

خیال ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کی زندگی نے کچھ اور وفا کی ہوتی تو کراچی میں اُردو یونیورسٹی قائم کر دیتے جس کے لئے وہ کتنے مضطرب اور کس درجہ کوشاں تھے۔ وقت کا تقاضا بھی تھا اور حالات بھی سازگار ہو چلے تھے لیکن انسان کی زندگی اس کے مقاصدِ جلیلہ کی زندگی سے ہمیشہ کم ہوتی ہے۔ وہ کتنی ہی طویل عمر کیوں نہ پائے بالآخر مرے گا۔ بڑے مقاصد کی بھی زندگی ہوتی ہے لیکن ہوتی ہے ہماری آپ کی زندگی سے علیحدہ جس پر کبھی موت بھی طاری نہیں ہوتی۔ ہوتا یہ ہے کہ

یہ مقاصدِ عظیمہ وقتاً فوقتاً اپنی زندگی کا کچھ حصہ ہمارے آپ کے حوصلے اور استعداد کے مطابق ہم کو ودیعت کرتے ہیں۔ اسی کے بقدر ہم کام کرتے ہیں پھر دوسروں کے لئے جگہ خالی کر دیتے ہیں مشیتِ الٰہی اس لئے تقدیرِ انسانی یہی ہے۔ کراچی میں اردو کا جو منصوبہ مولوی صاحب کے پیشِ نظر تھا اور جس کو علمی جامہ پہنانا وہ اپنا سب سے بڑا اور محبوب مقصد سمجھتے تھے، وہ آج ورنہ کل پورا ہو کر رہے گا۔ اور اس کو ترقی کے نئے منازل سے آشنا اور نئے تقاضوں سے عہدہ برآ کرانے کے لئے ہم میں عبدالحق آتے رہیں گے۔ ہر آدمی اپنے عمل کے خیر و شر میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے، مادّے کی طرح عمل بھی لازوال ہے، ایک طبعی دنیا میں دوسرا روحانی و اخلاقی زندگی میں، اس بڑے فرق کے ساتھ کہ خیر و شر کتنے ہی اضافی کیوں نہ قرار دیئے جائیں، خصوصیت و خاصیت کے اعتبار سے ایک بہر حال خیر اور دوسرا بہر حال شر ہے!

آج کل روپے پیسے یا ریاست کے حکم ناموں سے شبانہ روز یونیوسٹیاں وجود میں آتی رہتی ہیں بعض ممالک میں حکم ناموں سے شعر و ادب کی نوعیّت متعیّن کی جاتی ہے اور اس کے رُخ و رفتار کو بدلتے اور موڑتے رہتے ہیں لیکن دانش گاہیں دراصل طالب و اُستاد کی مدّتوں کے علمی ریاض و روایت سے ظہور میں آتی ہیں، حکومت کی مرضی و مصلحت کے مطابق دفعتاً جہاں تہاں نمودار نہیں ہو جایا کرتیں بیشتر تعلیم گاہیں اب بنائی نہیں ڈھالی جاتی ہیں۔ اس میں کسی کا قصور نہیں، وقت کا تقاضا اور زندگی اور زمانہ کی رفتار ایسی ہی ہے لیکن مولوی صاحب کی مجوزّہ یونیورسٹی ان کی علمی و ادبی خدمات پر تعمیر کی جائے گی جس کے لئے اُنھوں نے اپنی عمر کا سارا حصہ اور اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا تمام سرمایہ وقف کر رکھا تھا۔ ایسی یونیورسٹی کی فضیلت کا کیا کہنا!

مولوی صاحب کے بیشتر اور بہترین حصہ عمر کی کوششوں اور شرفائے فن اذب

کی اُمیدوں کا لہلہاتا ہوا باغ جو دکن میں اُجڑ گیا، کیا عجب وہ کراچی میں نمو پائے اور برگ و بار لائے! مولانا صاحب کی اس میں کتنی بڑائی نکلتی ہے کہ اُنھوں نے حکومت سے منہ موڑ کر جامعہ عثمانیہ کا بدل اپنی قوتِ بازو سے کراچی میں کرنا چاہا۔ اس کے لیئے دن رات ایک کر دیئے، کیسی کیسی دشواری اُٹھائی، بدنامی مول لی اور آخر دم تک کام کرتے رہے۔ اُنھوں نے اس کے لئے مرن برت نہیں جیون برت رکھا جو بڑی کٹھن چیز ہے۔ اِس لئے بہت کم لوگ حوصلہ کرتے ہیں اور اس کو نباہ سکتے ہیں۔ تمام عمر ہر طرح کی آزمائش میں مبتلا اور اس پر ثابت قدم رہنا چند دن کی تکلیف میں مبتلا رہ کر جان دینے، یا بچ رہنے سے بہر حال مشکل، اس لئے افضل ہے! معرکۂ خیر و شر میں مرنے کا نہیں، مقابلہ کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ مرن برت ممکن ہے کسی دن ممنوع قرار دے دیا جائے جیون برت کا مقابلہ کوئی مادی قوّت کبھی نہیں کر سکی ہے!

مولوی صاحب کی نظر میں حالؔی کی سیرت و شخصیت کا جتنا احترام تھا شاید ہی کسی اور کا رہا ہو۔ حالؔی کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں جیسے مرید اپنے مرشد کا کرتا ہو۔ یہ بات خاص طور پر اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ مولوی صاحب کا "اندازِ گفتگو" بالعموم ایسا نہیں ہوتا۔ سرسید کی بھی ان کی نظر میں بڑی منزلت ہے جس کا اظہار جگہ جگہ ملتا ہے لیکن اس اظہار کا انداز اور ہے اور اس احترام و عقیدت کا اور، جو حالی کے لئے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مزاج کے اعتبار سے مولوی صاحب دونوں میں کسی سے مشابہ نہیں۔ البتہ ان کے لکھنے کا اسلوب سرسیّد کے اسلوب کی نہایت ترقی یافتہ شکل ہے۔

سرسیّد نے سب سے پہلے اُردو نثر کو ایسے اسلوب متعارف کرایا جس میں ہر طرح کے خیالات و جذبات کا اظہار و ابلاغ کیا جاسکتا تھا۔ مولوی صاحب

کا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے سرسیّد کے اسلوب کی ابتدائی ناگزیر ناہمواریوں کو دور کرکے اس میں ادبی خوبیاں پیدا کردیں، سبب یہ ہے کہ مولوی صاحب انگریزی فارسی اور ہندی اندازِ خیال، اندازِ فکر و اندازِ بیان کے رموز سے واقف تھے۔ ان اسالیب کو اُنھوں نے اُردو نثر میں اس سلیقے سے سمویا کہ وہ سلیقہ اُردو کا سلیقہ بن گیا۔ چنانچہ مولوی صاحب کی نثر میں مشکل سے کوئی ٹکڑا ایسا ملے گا جس کو علیحدہ کرکے آپ بتا سکیں کہ یہ انگریزی فارسی یا ہندی کا چربہ ہے۔ برخلاف اس کے ہمارے اچھّے سے اچھّے نثرنگاروں کے یہاں آپ اس طرح کے ٹکڑوں پر آسانی سے اُنگلی رکھ سکتے ہیں۔ یہاں تک بتا سکتے ہیں کہ فلاں نے کسی اردو نثرنگار کو نہیں، فلاں اُردو شاعر کے اندازِ بیان کو اپنی نثر کا جز بنا لیا ہے۔ اندازِ بیان ہی نہیں جہاں تہاں وہ خود اس کی شاعری کو، حالانکہ اُردو نثر میں اُردو شاعری کا رنگ و آہنگ اب مقبول نہیں رہا۔ ان امور کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اُردو نثر کا مزاج جس کو خالصتہً اُردو کہا جا سکے غالبؔ، سرسیّد اور حالیؔ کے بعد مولوی صاحب کی تحریروں میں ملتا ہے۔

مولوی صاحب کو دکن میں کافی عرصہ تک کام کرنے کا موقع ملا۔ ان کی علمی، ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں کے اچھے سے اچھے نمونے وہیں کے قیام کے نتائج ہیں۔ دربارِ دکن، امرائے کبّار اور ریذیڈنسی کی آویزشوں اور ان کے متعلقین و متوسّلین کی ریشہ دوانیوں سے بچا رہنا اور اپنی آن قائم رکھنا مولوی صاحب کا معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ مطلب کتنا ہی ضروری اور مخاطب کیسا ہی صاحبِ اثر و اقتدار کیوں نہ ہو، مولوی صاحب گفتگو میں تکلّف و تملّق کو راہ نہیں دیتے تھے۔ بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی مستحق شخص، مفید ادارے یا ضروری اسکیم کے لئے چندہ یا عطیہ نہیں بلکہ جزیہ یا چوتھ وصول کر رہے ہوں۔ یا آج کل کے صحیفۂ اخلاق یا اصلاح

میں کسی کی یادگار قائم کرنے یا الیکشن لڑنے کے لئے استحصال بالخیر یا بالجبر کے درپے ہو۔

اچھے مقصد کی حمایت کرنے میں مولوی صاحب بڑے سے بڑے آدمی کے جبر و قہر کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اس صفت میں وہ بہتوں سے بہت ممتاز بھی تھے اور بدنام بھی۔ یہ سب اس لئے ممکن تھا کہ مولوی صاحب کے خلوصِ نیت اور حسنِ عمل کا ہر شخص قائل تھا۔ کسی کے دل میں یہ وسوسہ نہیں گزرتا تھا کہ علمی و تعلیمی مشاغل کے علاوہ ان کا کسی مشتبہ سرگرمی یا ذاتِ گرامی سے تعلق تھا۔ حیدرآباد کے تمام چھوٹے بڑے غیر ملکی متوسلین میں شاید مولوی صاحب ہی کی ذات ان چند مستثنیات میں ہے جو وہاں کے کوچہ سے بے آبرو ہو کر نہیں نکلی۔ اُردو دوستی کی روایت مولوی صاحب کو سر سیّد اور محسن الملک نے دی۔ اِس روایت کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے میں اُنھوں نے جیسی مسلسل اور بے بہا خدمات انجام دی ہیں ان میں ان کا ثانی نامعلوم مدّت تک شاید کوئی اور نہ پیدا ہو۔

اُردو کی ابتدا اور ارتقا کے بارے میں مولوی صاحب کی تحقیقات کیا ہے۔ اس کی حفاظت و اشاعت میں ان کا کیا حصّہ ہے، اس کی کِن اصناف کو اُنھوں نے کس طرح آراستہ و استوار کیا اور ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچایا ان امور کی تلاش ان کی تحریر و تقریر میں کرنا چاہیئے جن کے جستہ جستہ نمونے ان سطور کے آخری صفحات میں ملیں گے۔ مشکل اُردو لکھنے کی جتنی مذمّت اور آسان لکھنے کی جتنی تعریف و تبلیغ مولوی صاحب نے کی ہے ان کے پائے کے کسی دوسرے اُردو شناس اور اُردو نگار نے نہ کی ہوگی، نہ اس پر کاربند ہوئے ہوں گے۔

ہم میں کس کو اس بات کا علم نہ ہوگا کہ تقریباً پچھلے سو سال سے اچھے اُردو نگار کی پہچان ہی یہ رکھی گئی ہے کہ وہ ہر طرح کے خیالات و جذبات کو سلیس عام فہم اُردو میں ادا کر سکتا ہو۔ سب سے پہلے یہ صفت غالب میں اس کے بعد سر سیّد میں،

پھر حالیؔ ہیں، ان کے بعد انھیں مولوی عبدالحق میں پائی اور سراہی گئی۔ اس کے برخلاف خطیبانہ یا شاعرانہ اسلوبِ بیان کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا اور اتنی سی بات بتانے کے لئے غالباً پیغمبر کی ضرورت نہ محسوس کی جائے گی کہ سہل و سلیس اُردو اگر کسی زبان سے سب سے قریب ہے تو وہ ہندی ہے اور جن زبانوں سے دور ہے وہ فارسی اور عربی ہیں، یہ اور بات ہے کہ ہندی خود سلیس و سہل اُردو سے نہیں سہل و سلیس ہندی سے بھی دُور بہت دُور چلی جا رہی ہو۔

مولوی صاحب پر یہ الزام رکھا جاتا ہے کہ اُنھوں نے کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات کے زمانے میں اُردو کو دو قومی نظریے کی تائید کا آلہ بنایا۔ بات دراصل یہ ہے ہندوستان میں انگریزوں کے اثر و اقتدار کے ساتھ ہی ہر چیز ہندو مسلم رنگ میں دیکھی اور پرکھی جانے لگی۔ اس میں انگریزوں نے اپنا فائدہ دیکھا، مسلمانوں نے اپنا، ہندوؤں نے اپنا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ سوا انگریزوں کے سب نے غلط دیکھا۔ ظاہر ہے جہاں غلط یا صحیح انگریز ہندو مسلمان سب کو فائدہ مدِ نظر ہو یا دکھائی دیتا ہو وہاں غلطی پر ہونے کا الزام کون قبول کرلے گا۔

مذہب، فرقہ، زبان، علاقے، اکثریت و اقلیت کے اختلافات انگریزی حکومت کے عہد سے آج تک جس شکل و شدّت سے جن مواقع پر سر اُٹھاتے رہے ہیں یا اُن کو شہ دی گئی ہے اس سے کوئی بے خبر نہیں، ان کے اسباب و انسداد کے تدابیر بھی دریافت کئے جا چکے ہیں، ان پر بیشمار صفحات ہر روز سیاہ کئے جاتے ہیں، کتنے مباحثے منعقد اور کمیشن کمیٹیاں مقرر ہوتی رہتی ہیں اور کیسے کیسے محراب و منبر ان کی تلقین یا تصفیے کے لئے کام میں لائے جاتے ہیں، وہ بھی پوشیدہ نہیں۔ لیکن جو بات کسی کے بس کی نہیں وہ یہ ہے کہ انسداد یا اصلاح کے تدابیر پر عمل

کون کرے اور کیسے کرے۔

اُردو کا بیشتر مسلمانوں کی مادری زبان ہونا اتنا اُردو کا گناہ نہیں معلوم ہوتا جتنا شاید مسلمانوں کا، یہ اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ اُردو بے شمار ہندوؤں کی بھی مادری زبان ہے جس کا وہ بڑی منصفی و جرأت سے برابر اظہار و اعلان کرتے رہتے ہیں۔ اپنے حسن و افادیت کے اعتبار سے اُردو مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں میں بھی اتنی ہی مقبول و کارآمد نہ ہوتی جتنی کہ رہی ہے اور اب بھی ہے تو اس کو سارے ملک میں اتنی وسیع و قیع شہریت (CITIZENSHIP) کیسے نصیب ہوتی جو کسی دوسری ہندوستانی زبان کو نہیں ہے۔ اس غیر معمولی امتیاز کے لئے اُردو ہندوستان کی دور و نزدیک کی تمام بولیوں اور ان کے بولنے والوں کی احسان مند بھی اور محسن بھی! یہ ایک سانحہ ہے کہ اُردو جو کسی وقت ہندوستان میں ہندو مسلمان کو یکجا کرنے اور رکھنے کے لئے وجود میں آئی تھی اور اس نے اس فریضے کو حسن و خوبی سے انجام بھی دیا تھا، آج ہندو مسلمانوں میں نفاق و افتراق پیدا کرنے کا سبب قرار دی جائے۔

سوال یہ ہے کہ اگر کوئی اُردو کو اپنی مادری زبان قرار دے اور اس بنا پر اس کی توقع رکھے کہ اس کی زبان کی حفاظت و ترقی میں اس کی مدد کی جائے گی تو اس میں کیا قباحت ہے، جبکہ وہ ہر طرح اور ہمہ وقت ہندی کو قومی، ملکی، حکومتی زبانوں اور حکومت کو سیکولر جمہوریہ حکومت مانتا ہو۔ اسی طرح اگر وہ یہ بھی کہے کہ اُردو اس کی تہذیبی، علمی اور ادبی زبان ہونے کے ساتھ مذہبی زبان بھی ہے اس لئے اُردو کی حمایت کی جائے اور اس کو نقصان نہ پہنچنے دیا جائے تو اسے قومی و ملکی مفاد و مقاصد کا منافی کیوں قرار دیا جائے؟

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف بولیاں مادری زبان کی حیثیت

رکھتی ہیں۔ یہی مادری زبان وہاں کے باشندوں کی مذہبی، تہذیبی علمی اور ادبی زبان کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ اس لئے اگر کسی جماعت یا قبیلے کی مادری زبان اور مذہبی و تہذیبی زبان ایک ہی ہو تو بدگمان نہ ہونا چاہیئے، نہ زبان سے کام لینے والوں سے! چنانچہ اردو کی حمایت اس بنا پر کرنا کہ وہ بیشتر ہندی مسلمانوں کی مادری زبان ہونے کے ساتھ ان کی مذہبی، تہذیبی علمی اور ادبی زبان ہے، کوئی بُری بات نہیں ہے، دوسری دیسی زبانوں کے مقابلے میں اُردو کا یہ امتیاز بھی کچھ کم قابلِ لحاظ نہیں ہے کہ ہندوؤں کی مذہبی زبان نہ ہونے کے باوجود، ان میں سے بہتوں کی وہ مادری، مذہبی ادبی و علمی زبان بھی ہے۔!

اس سلسلے میں ایک بات اور ذہن میں آتی ہے وہ یہ کہ اُردو بولنے والے جب اپنی زبان کے لئے وہ سہولتیں حاصل کرنا چاہتے ہیں جو عام طور سے کسی زبان کی نشوونما کے لئے ضروری ہیں تو اس سے محض ایک زبان کو باقی رکھنے کے فطری جذبے کی تسکین مقصود نہیں ہے۔ اُردو کی حفاظت و توسیع کا بنیادی مقصد اس تہذیب کی بقا اور ترقی سے عبارت ہے جو ہندوستان ہی کی مختلف قوموں، نسلوں اور تہذیبوں کی باہمی مفاہمت و یگانگت سے وجود میں آئی میرا عقیدہ یہ ہے کہ اُردو آج بھی ہندوستان کے مختلف تہذیبی عناصر میں اس جذباتی ہم آہنگی کو پیدا کرنے میں غیر معمولی حد تک معین ہوسکتی ہے جس کی ملک کو بڑی ضرورت ہے۔ ہندوستانی تہذیب کا سب سے نمایاں امتیاز یہ ہے کہ وہ مختلف تہذیبی عناصر کی موجودگی اور ان کے اثرات کے خوشگوار و خوش آیند امتزاج سے عالمی تہذیب کا مظہر بن گئی اور اس طور پر ہندوستانی ریاست قومی ہوتے ہوئے ایک عالمی ریاست کا نقشہ پیش کرتی ہے۔

اس عالمی ریاست کے قیام کے سلسلے میں جو مسائل اور ذمہ داریاں درپیش

ہیں کم وبیش اسی قسم کے مسائل اور ذمہ داریاں، ہندوستانی ریاست کی تشکیل میں بھی سامنے آرہی ہیں، اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کا اثر دنیا کے آئندہ نقشے پر بہت گہرا پڑے گا۔ ہم آج عالمی مسائل کے حل میں جو مدد دے رہے ہیں اس کا ثبوت ہم کو خود اپنے ملک کے اندر عملی طور پر دینا چاہئے۔ سچی وطن دوستی اور سچی انسان دوستی میں کوئی فرق نہیں۔ انسان دوستی بغیر وطن دوستی ایک واہمہ اور وطن دوستی بغیر انسان دوستی ایک مغالطہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اردو کے خیر خواہ اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے شیدائی تاریخ کے اس چیلنج کو قبول کریں گے جو اس نے ہندوستان کے سامنے رکھا ہے اور جدید ہندوستانی تہذیب کی صحت مند اور دلکش تشکیل میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں گے۔

دو تین سال ہوئے مولوی صاحب نے پاکستان رائٹرز گلڈ میں ایک خطبہ دیا جو بڑی اہم و فکر انگیز دستاویز اور دستور العمل ہے۔ اس میں زبان و ادب اور اس کے خدمت گزاروں سے متعلق کتنی بیش بہا باتیں جو صدیوں کے تجربے پر مشتمل تھیں، بڑے پُر درد اور عالمانہ انداز میں کہی گئی ہیں اور ان ادبی و تہذیبی میلانات کی نشان دہی کی گئی ہے جن کو ترقی دینے کی ذمہ داری اور ادیبوں پر عائد ہوتی ہے جو اپنے ادب کی نشو و نما کو نہ صرف قومی تہذیب و تمدن کو مالا مال کرنے کی کوشش پیہم قرار دیتے ہیں بلکہ بالواسطہ عالمی ادب اور عالمی یگانگت میں قابلِ قدر اضافے کا وسیلہ بھی مانتے ہیں۔

اس سلسلے میں مولوی صاحب نے خاص طور پر فرانس اور ہندوستان کی دو عظیم علمی تہذیبی تحریکوں اور ان کے عظیم معماروں کا نام لیا ہے، ایک عظیم انسائیکلو پیڈسٹ تحریک کے روحِ رواں ڈینس ڈڈرو (DENISDIDEROT 1713 - 84)

اور دوسرے علی گڑھ تحریک کے بانی سیّد احمد خاں کا۔ ایک کو تاریخ کی وساطت سے جانتے تھے، دوسرے کو اُنھوں نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا اور اس سے فیضیاب ہوئے تھے۔ اپنے اس مشاہدے و مطالعے سے اُنھوں نے جو گہرا اثر قبول کیا اور جس طور اپنی خداداد ذہنی و عملی صلاحیتوں کو اُردو کی بڑائی اور بھلائی میں صرف کیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحب اُردو کی حفاظت و حمایت کو کسی محدود جماعت یا کسی مخصوص سیاست کی بے جا پاسداری کا ذریعہ نہیں بنانا چاہتے تھے۔ ان کا نصب العین یہ تھا کہ ان تہذیبی اقدار و عوامل کی تائید و اشاعت کی جائے جن کی ترجمانی و تبلیغ اُردو کرتی تھی۔ اتنا تو سب مانتے ہیں کہ اُردو جغرافیائی، نسلی، مذہبی اور تہذیبی اختلافات کو جنم دینے کی سازش کا نتیجہ نہیں ہے، نہ اس کو کسی مطلق العنان بادشاہ یا حکومت نے کوئی "فرمان واجب الاذعان" جاری کرکے جاری کیا تھا۔ یہ تو اختلافات کو دُور کرنے اور ذہنی یک رنگی و جذباتی یگانگت پیدا کرنے کی بہترین کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ملک کے عوام و خواص، امیر و غریب، عالم و عامی کے آزادانہ اتحادِ خیال، اتحادِ مقاصد اور اتحادِ رسم و راہ سے ایک بنیادی جمہوری تقاضے کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آئی۔ اس زبان نے جس ادب اور تہذیب کو پیدا کیا اس نے نہ صرف ہند و پاکستان میں کروڑوں بسنے والوں کو باہم دگر ربط دیا اور ان میں مکمل ہم آہنگی پیدا کی۔ اِس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مولوی صاحب کی شخصیت اور ان کے کام کا ہمارے عہد میں درجہ اور ہماری نظر میں وہی منزلت ہے جو متذکرہ صدر دو تحریکوں اور ان کے بانیوں کا دنیا کی تہذیبی تاریخ میں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ باوجود ان مصیبتوں کے جو تقسیمِ ملک کے آشوب میں مولوی صاحب کو پیش آئیں اور اس نقصان کے جو ان کے کام اور انجمن کے

کتب خانے کو پہنچا، وہ بدستور ہندوستان میں رہ کر اُردو کی خدمت چاہتے تھے، ان کے ارادے واستقامت میں سرِ مو فرق نہیں آیا تھا، مشورہ کرنے علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ اولڈ بوائز لاج میں قیام تھا۔ اضطراب وعزم کی ملی جلی وہ کیفیت اب تک نہیں بھولی جو ان کے مردانہ نورانی سراپا پر طاری اور رگ رگ میں پیوست نظر آتی تھی۔ تصور میں یہ نقشہ اس لئے واضح و پائدار ہے کہ اس زمانے میں تقسیمِ ملک کی عالمگیر ہولناکی اور آس پاس کے سانحاتِ قتل وغارت نے ہر چھوٹے بڑے کو بے قرار و بے بس کر رکھا تھا۔ بوڑھے مجاہد کا یہ جلال وجمال دیکھ محسوس ہونے لگتا جیسے آزمائش کا سامنا ہو تو جان، مال ناموس، احباب اقربا کسی کی پروانہ کرنا چاہیے، صرف اپنا فرض بجا لانا چاہیے۔ پھر یہ یاد آتا ہے کہ اس مایوسی کو مٹانے اور ہمت و حوصلے کو زندہ رکھنے اور اس سے کام لینے کے لئے غیب سے کیسے "مردانِ کار" مامور و مبعوث ہوتے رہتے ہیں اور اسلاف کے بارے میں جو کچھ بزرگوں سے سُنا ہے یا کتابوں میں پڑھا ہے وہ کم و کاست صحیح ہو تو کیا عجب!

کئی دن تک گفتگو رہی، بالآخر مولوی صاحب مایوس و ملول اس "متاعِ کنعان" (اُردو) کو لے کر "بازارِ مصر" (پاکستان) پہنچے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں وہ اس یوسف کے یعقوب بھی رہے زلیخا بھی۔ اُردو کی پذیرائی پاکستان میں کیسی ہوئی اور ہندوستان میں اس کا کیا حال ہے، کھلی ہوئی داستان ہے جس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔

مولوی صاحب کراچی پہنچے تو اُردو کالج کی بنیاد رکھی۔ انجمن ترقیٔ اُردو کی ازسرِ نو تنظیم کی۔ اُردو یونیورسٹی کی مہم کا آغاز کیا۔ اُردو کو پاکستان کی قومی و ملکی زبان قرار دیئے جانے کی تحریک چلائی اور اپنے تصنیفی، تحقیقی اور تبلیغی کاموں میں اس طرح منہمک ہو گئے جیسے کراچی میں نہیں حیدرآباد دکن اور دہلی میں کام کر رہے ہوں۔

منعم بہ کوہ و دشت و بیاباں غریب نیست
هر جا کہ رفت، خیمہ زد و بارگاہ ساخت

منعم پر ہی نہیں مولوی صاحب پر بھی صادق آتا ہے!

کوئی مہم آج تک فرزانوں سے سر نہ ہوئی۔ اس لئے کہ دیوانوں ہی کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اُردو کی "وادیٔ پُرخار" اپنے کانٹوں کی پیاس بجھانے کے لئے ہمیشہ کسی "آبلہ پا" کی منتظر رہے گی اور مولوی صاحب جیسا بے زنہار آبلہ پا اس وادی سے اب تک نہیں گزرا۔!

تمام عمر مولوی صاحب سے زیادہ واضح و مدلّل طور پر اُردو کے ہندی نژاد ہونے کی شاید ہی اُردو کے کسی اور مستند سکالر نے وکالت کی ہو۔ ان کی تمام عمر یہی بتانے میں گزری کہ اُردو باہر سے نہیں لائی گئی، اس نے یہیں جنم لیا اور پروان چڑھی، کسی نے اس کو کسی کے سر نہ تھوپا، یہ جہاں گئی، جس زبان، قوم اور ماحول سے سابقہ پڑا اس کی خوبی لی، اپنی خوبی دی، تمام ملک کو جو مدّتوں سے طرح طرح سے بٹا ہوا تھا اس نے متحد و مضبوط کیا، اس ملک کو آزادی دلانے میں وہ ملک کی کسی دوسری زبان سے پیچھے نہیں رہی۔ مختصر یہ کہ وہ ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کی مشترک تہذیب و رسم و راہ کی بڑی دل آویز تصویر ہے۔

اُردو کی ان صفات کی طرف پچھلی سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہاں اس کا ذکر اس لئے آگیا کہ ایک زمانے میں یہ باتیں بالخصوص اُردو کے ہندوستان کی مشترک تہذیب کا بڑا صحت مند و مبارک قابل نمونہ ہونا اس کی سب سے بڑی صفت سمجھی جاتی تھی اور اس بنا پر ہر طرف محبوب و مقبول تھی۔ لیکن اس کا یہی سب سے بڑا ہنر اب اس کا سب سے بڑا عیب خیال کیا جانے لگا ہے، یہاں تک کہ اردو کی ان صفات پر آج کل زور دینا یا ان کی طرف اشارہ کرنا

مخالف عناصر کو اشتعال دینے کا موجب ہوتا ہے، بہ ہیں تفاوت رہ ا!

مولوی صاحب پر چاہے جتنے اور الزام عائد ہوتے ہوں، ان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اُردو ہندی کے مسئلے میں فرقہ وارانہ ذہنیت رکھتے تھے بڑی ناانصافی ہوگی۔ مولوی صاحب سے اس بنا پر بدگمان رہنے والوں کو کیسے یقین دلایا جائے کہ بعض حلقوں سے یہ آواز اکثر سنائی دی ہے کہ مولوی صاحب کا مسلک اُردو تھا۔ اور شاید وہ خود ان لوگوں میں تھے جو مذہب سے زیادہ اپنے مسلک کے پابند ہوتے ہیں۔

مولانا سید سلیمان اشرف صاحب مرحوم جیسے پکّے مسلمان اور کھرے انسان تھے۔ سب جانتے ہیں مولوی صاحب سے بڑی دوستی و بے تکلّفی تھی۔ اُردو، اسلام، تہذیب، ثقافت اور اس طرح کے دوسرے مسائل پر دونوں میں بڑے لطف کی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ مولوی صاحب جب بھی علی گڑھ آتے "خانقاہ سلیمانیہ" میں مولانا کے یہاں چائے پیتے اور ان کی بے تکلف و دلچسپ گفتگو سننے کے لئے حلقہ نشین ہو جاتے۔ عربی کے صفات پر مولانا زور دیتے، مولوی صاحب اُردو کے گُن گناتے۔ یہ صحبتیں سالہا سال رہیں۔ مولانا نے مولوی صاحب کو "کالا کافر" کا لقب دے رکھا تھا اور ہم لوگوں کو اپنے یہاں کی نشست کی دعوت ہی یہ کہہ کر دیتے تھے کہ فلاں وقت آجانا "کالا کافر" آیا ہوا ہے!

مولوی صاحب امرا و شرفا کی طرح زندگی بسر کرتے تھے، اچھی جگہ اچھا مکان، اچھا ساز و سامان، اچھا کھانا، اچھی صحبت، مہمانوں کی تواضع و تکریم، سیر و سفر کا شوق، احباب کے دکھ درد کے شریک، علمار کا احترام، ارباب اقتدار سے مساوی سطح پر ربط و ضبط، دُھن کے پکّے، عمدہ چیزوں کو حاصل کرنے، نایاب نسخوں اور کتابوں کو حاصل کرنے کا شوق، غرض ان میں وہ تمام خصائص و خوبیاں ملتی ہیں جو اس عہد

کے اکابر میں عام تھیں۔

مولوی صاحب نے علی گڑھ کے عہد طالب علمی سے قیام دکن و دہلی کے زمانے تک کم وبیش ۷۰ سال جس ماحول میں زندگی بسر کی اور کام کیا وہ امیرانہ و آمرانہ تھا جس کو یکسر بدلے ہوئے حالات میں نباہنا بڑا مشکل ہوتا ہے، یہ بھی ایک سبب تھا کہ تقسیمِ ملک کے بعد کراچی تشریف لے گئے تو غیر متوقع طور پر ایسے گردوپیش سے دوچار ہوئے اور ایسے حالات وحوادث کا سامنا ہوا جن سے تمام عمر سابقہ نہیں پڑا تھا۔ آمرانہ مزاج عوامی مطالبے کا متحمل نہ ہوا۔ مولوی صاحب کی زندگی کا یہ بڑا اندوہناک باب تھا اسے ملٹری حکومت کے حسنات میں سمجھا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس نے مولوی صاحب اور ان کی انجمن کو از سر نو سرفراز و بحال کیا۔

بہت دن ہوئے یونیورسٹی یونین میں ایک جلسہ تھا۔ تقریب یاد نہیں رہی۔ مولوی صاحب موجود تھے، خلافِ معمول کسی قدر مضمحل و فکرمند۔ حاضرین نے تقریر کی فرمائش کی۔ تیار ہوئے، بڑے تھکے اور غمگین لہجے میں کہنا شروع کیا: اے صاحبو! کیا تقریر کروں، معلوم نہیں آپ کیا سننے کے مشتاق ہیں۔ مجھے تو تمام عمر ایک ہی رنگ رنگتا آیا اور وہ اموا رنگ ہے یعنی اردو۔ اتنا کہہ کر تھوڑی دیر کھڑے رہے جیسے یادوں کے کھنڈر یا تجربات کے خارزار میں کچھ تلاش کر رہے ہوں۔ اس کے بعد تقریر شروع کر دی۔ اموا رنگ رنگنے کا فقرہ اس درد و درماندگی سے کہا تھا کہ آج تک ذہن میں گونج رہا ہے۔

مشرقی پاکستان میں اردو کو لازمی یا حکومتی زبان قرار دیئے جانے کی جو کوشش مولوی صاحب یا دوسروں نے کی اس میں جس ناخوشگواری کا سامنا ہوا وہ سب جانتے ہیں۔ حالات میں اعتدال آئے گا تو اس کو وہیں آنا پڑے گا

جہاں مولوی صاحب لانا چاہتے تھے۔ مشرقی پاکستان ہو یا مغربی مولوی صاحب کی تحریک کو قبل از وقت تو کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے صحیح ہونے میں کلام نہیں۔ مشرقی بنگال کو دیر یا سویر علاقائیت کی تنگنائے سے اپنے کو باہر نکالنا پڑے گا۔ جہاں اچھے شاعر اور شاور پیدا ہوتے ہوں وہاں حدود و حصار دیر تک قائم نہیں رہ سکتے۔

یہاں اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ جو قومیں کسی بیرونی طاقت کے شکنجے میں جکڑی ہوتی ہیں وہ تھوڑی سی کوشش سے جلد رہائی حاصل کر لیتی ہیں لیکن جو اپنے ہی بنائے اور اختیار کئے ہوئے طوق و سلاسل میں گرفتار ہوں وہ بڑی مدت میں "بعد از خرابی بسیار" ان سے نجات پاتی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان بندشوں سے کون کب رہائی حاصل کرتا ہے! سید سلیمان ندوی اور مولوی عبدالحق پاکستان میں اردو کو جو درجہ دلانا چاہتے تھے وہی منصب ہندوستان کی حکومت ہندی کے لئے ہندوستان میں حاصل کرنا چاہتی ہے اور دونوں حق بجانب ہیں اس لئے کہ ریاستوں کی زبانیں اپنے حدود کے اندر اپنے باشندوں کے لئے اپنے اپنے طور پر کتنی ہی اہم کیوں نہ ہوں اور حکومت کو ان کی اہمیت کو من و عن تسلیم بھی کرنا چاہئے، جس حکومت پر وہ ریاستیں مشتمل ہیں اس کی (سرکاری) زبان کے رشتے میں ان تمام ریاستوں اور زبانوں کو یقیناً منسلک ہونا چاہئے خواہ حکومت یا مرکز کی زبان تمام دوسری زبانوں سے مختلف اور علیحدہ کیوں نہ ہو۔ اس کے بغیر وہ مختلف النوع اور نہایت درجہ اہم گرفت نہیں قائم رکھی جا سکتی جو مشمولہ ریاستوں پر مرکز کی از بس ضروری ہے۔ اور وہ ربط بھی بروئے کار نہیں آسکتا جو ریاستوں کا ایک دوسرے سے ہونا چاہیئے۔ اس طرح ایک ایسی زبان کو بھی اختیار کرنا لازم آتا ہے جو بین الاقوامی و بین المملکتی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے موزوں و مناسب

ہو، یہی نہیں اگر کبھی دنیا کا کاروبار آسمان پر بھی پھیل گیا تو آسمان والوں کی بھی کسی نہ کسی ایک زبان کا سیکھنا ہم پر لازم آئے گا اور ہم سے زیادہ شاید آسمان والوں کو ہماری زبان سیکھنے میں اتنا نہیں جتنا سیکھنے کے لئے کسی ایک زبان کے انتخاب کرنے میں دقت پیش آئے تو کوئی عجب نہ ہوگا، بہرحال ایک بات یاد رکھنا چاہئے کہ کوئی زبان بدیسی نہیں ہے، اگر وہ دیس کے کاموں کے لئے مفید و کارآمد ہو۔

مولوی صاحب میں بے شمار خوبیوں کے ساتھ کچھ کمزوریاں بھی تھیں جو اس مزاج و ماحول کا خاصہ ہیں جو مولوی صاحب کا تھا لیکن ان کو معرضِ بحث میں لانا ضروری نہیں سمجھتا۔ انسانی ذہن اور آیندہ نسل میں انسان کی فضیلتوں ہی کی یاد باقی رہے تو اچھا ہے! خوبیوں کو جتانا اور کمزوریوں کو نظر انداز کرنا کسی اور کے مطابق ہو نہ ہو، آئین سیرت نگاری کے مانے ہوئے ضوابط کے خلاف یقیناً ہے جہاں ہر شخص کے کھرے کھوٹے کو علیحدہ کر کے دکھاتے ہیں۔ میں سیرت نگاری کے فرائض انجام دینے کے منصب پر فائز ہونے یا کئے جانے کا خواہش مند بھی نہیں ہوں۔ کسی کی خوبیوں کو جتانے اور کمزوریوں کو چھپانے کے طریقے کو اصولاً صحیح نہیں سمجھتا لیکن عملاً اس کو غلط بھی نہیں قرار دیتا، اس لئے کہ دیکھا اکثر یہ جاتا ہے کہ بُرے بدنیت اشخاص بڑے اور اچھے لوگوں کی تمام خوبیوں سے منہ موڑ کر ان کی صرف ایک آدھ کمزوریوں کو اپنی بد اعمالی و بے راہ روی کے جواز میں چُن لیتے ہیں۔

یہاں ایک عزیز کا سُنایا ہوا لطیفہ یاد آتا ہے۔ ڈاکٹر جانسن کی ضخیم انگریزی ڈکشنری شائع ہوئی تو چند دنوں بعد موصوف کی خدمت میں ایک خاتون تشریف لائیں اور فرمایا: ڈاکٹر صاحب آپ نے اس لغت میں فحش الفاظ کثرت سے

شامل کر دیئے ہیں! ڈاکٹر جانسن نے جواب دیا: "محترمہ آپ نے تلاش ہی ایسے الفاظ کئے!!

کسی کے عیب نکالنے سے بہتر مشغلہ چپ رہنا ہے اور دونوں سے بہتر اس کی خوبیوں کو ظاہر کرنا ہے۔ اس طریقِ کار سے فن کا حق ادا ہوتا ہو یا نہیں یہ فن کار اور ان کے مربی یا محتسب جانیں، میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ انسان اور انسانیت کے تقاضے فن اور فن کار کے تقاضوں سے وسیع تر اور عظیم تر ہوتے ہیں اس لئے ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ انسانی زندگی کی تمام خامیوں کو یہ کہہ کر نظر انداز کرنے ہی کی نہیں ان کو پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کرنے کی وکالت کی جاتی ہے کہ فلسفہ اور سائنس کے انکشافات ان کمزوریوں کے حق میں ہیں لیکن اس کو کوئی نہیں دیکھتا کہ سائنس اور فلسفے کے علاوہ انسان ہی کے مدوّن کئے ہوئے کچھ اور علوم وانکشافات بھی ہیں جو انسان کے حیوانی تقاضوں کو قابو میں رکھنے اور ان کو عملِ صالح میں ڈھالنے کے حق میں ہیں۔ نباتات کا ماہر کسی اچھے پھل پھول کے درخت کو اصل کی طرف لوٹ جانے (یعنی جنگلی ہو جانے) کے حق میں نہ ہوگا بلکہ طرح طرح کے ترکیبوں اور تجربوں سے اس کی کوشش کرے گا کہ اس پھل یا پھول کی جنگلی صلاحیتیں مزید خوبصورتی اور افادیت کی صلاحیتوں کا باعث بنتی جائیں اور وہ پھل یا پھول سے بہتر ہوتا جائے۔ جانوروں میں بھی اس کا لحاظ رکھتے ہیں۔ صرف انسان ایسا ہے جس کو انسان دورِ وحشت کی طرف رُخ کرنے اور مائل رہنے کی ترغیب دیتا ہے اور اس کے لئے سائنس اور مشین کی تمام برکتیں فراہم کرتا رہتا ہے۔

موجودہ دنیا کی بے یقینی و محرومی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم فن اور فن کار، سائنس اور سائنس کار کو انسان و انسانیت پر ترجیح دینے لگے ہیں کبھی

تو ایسا گمان ہونے لگتا ہے جیسے انسانیت کو فن اور سائنس کی غلامی میں دے دیا گیا ہو! حالانکہ ان دونوں کو ہر حال میں انسانیت کا تابع رہنا چاہیئے، جہاں خاک نشینی نہ آتی ہو وہاں عرش پروازی زبردست خطرہ ہے۔ اس سے سائنس یا فن کی تنقیص یا توہین منظور نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ دونوں بھی انسان کی بہترین صلاحیتوں کا ثمر ہیں، مقصود دراصل دونوں کے لئے مناسب مقام (حفظِ مراتب) کا تعین ہے!

۳۵، ۲۰ سال اُدھر سب سے پہلے علی گڑھ میں مولوی صاحب کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، اس وقت بھی سن رسیدہ ہی معلوم ہوتے تھے۔ لیکن ذہانت، زندہ دلی، محنت و مستعدی کا جو عالم اس وقت تھا وہ ان میں آخر دم تک قائم رہا۔ توانائی کا معلوم نہیں کیسا لازوال خزانہ ان میں ودیعت تھا، تھکنا، مایوس ہونا، ہار ماننا تو جیسے جانتے ہی نہ ہوں۔ چھوٹے بچوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان میں انرجی (توانائی) پیدا زیادہ، خرچ کم ہو پاتی ہے۔ اس لئے نچلے نہیں بیٹھیں گے، نہ دوسروں کو بیٹھنے دیں گے۔ اس کے بعد بھی توانائی کا پورا کوٹہ خرچ نہیں کر پاتے! مولوی صاحب کا بھی کچھ اسی طرح کا حال تھا۔ بچوں ہی کی مانند ان میں شوخی و شگفتگی تھی۔ کسی بات کا کیسا ہی ردِّ عمل ہو فی الفور اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے، بچوں ہی کی طرح جلد خفا اور جلد خوش ہو جاتے۔ بچپن کی نعمتوں کا کیسا اور کتنا عجیب و قیمتی اندوختہ مولوی صاحب کے حصے میں آیا تھا کہ اس نے ان کو اکیانوے (۹۱) سال تک بوڑھا نہ ہونے دیا۔

اُردو سے ان کا یہ شغف دیکھ کر کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی غریب ماں اپنی تنہا لڑکی کے جہیز کے لئے ہر طرح کا اچھا اور کارآمد سامان جلد سے جلد جہاں جس سے جس قیمت پر بن پڑے، فراہم کر لینا چاہتی ہو اور اپنی لڑکی کے بارے میں

پاس پڑوسی کو کوئی ایسی ویسی بات مشہور کرتے سُن پائے اور بپھر جائے اور اس کی بریت میں وہ سب کر گزرے جو صرف ایک ماں اپنی لڑکی کے لئے کر سکتی ہے اور اسی بنا پر تعریف کے بھی قابل ہوتی ہے اور درگزر کی مستحق بھی!

مولوی صاحب کے تیور اور طور طریقوں کا اس ایک واقعے یا لطیفے سے اندازہ لگائیے، حیدر آباد کے اعیان و اکابر کے لئے لازم تھا کہ مقررہ لباس میں دربار یا سرکاری تقریبوں میں حاضر ہوا کریں، ایسے ہی ایک موقع پر ہز ایگزالٹڈ ہائینس نے مولوی صاحب کو ان کے اپنے معمولی لباس ترکی ٹوپی اور شیروانی میں موجود پایا۔ دوسرے دن ندیم سلطانی نے حاضر ہو کر مولوی صاحب کو اعلیٰ حضرت کی ناگواریٔ خاطر کی اطلاع، اور فرمانِ سلطانی سے آگاہ کیا کہ آئندہ دربار کے مقررہ لباس میں حاضر ہوا کریں۔ مولوی صاحب نے نامہ بر کو اپنی ناگواریٔ خاطر نہیں، برہمیٔ مزاج سے نوازا اور آخر میں فرمایا: جاؤ کہہ دینا میں اپنے لباس کو ترک نہ کروں گا، اس نے معلوم نہیں وہاں جا کر کیا کہا اور کیسے کہا، کچھ دنوں بعد اسی طرح کی ایک تقریب میں پھر سامنا ہو گیا، اعلیٰ حضرت نے ندیم خاص سے جو ہمرکاب تھے: پوچھا: "کیوں یہ وہی مولوی ہے؟" اس نے سر جھکا کر عرض کیا: "حضور وہی" پھر فرمانروائے دکن اور "مجذوب دکن" اپنے راستے پر ہو لئے!

پچھلے سطور میں کہیں اقرار کر آیا ہوں کہ اس مضمون کے آخر میں مولوی صاحب کے فرمودات سے جستہ جستہ اقتباسات پیش کروں گا۔ مقصد یہ تھا کہ اس سے ان کی سیرت، شخصیت، نقطۂ نظر، وسعتِ علم، اصابتِ فکر اور دوسرے صفات کے مختلف پہلو سامنے آتے اور اندازہ ہو سکتا کہ جن خیالات، جذبات و افکار کے اظہار کے لئے انھوں نے جو زبان، لہجہ اور اسلوب اختیار کیا ہے وہ موقع و محل کے اعتبار سے کتنا حسبِ حال ہے، اس سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ اعلیٰ

شخصیت اور اعلیٰ انشا پردازی کس طرح ایک دوسرے سے نشوونما پاتے اور ایک دوسرے کو جلا دیتے ہیں۔ خیال تھا کہ یہ کام اتنا مشکل نہ ہوگا جتنا کہ اس وقت معلوم ہوا جب ان اقتباسات کے انتخاب و ترتیب کا مرحلہ آیا۔ متوقع کتابوں اور تحریروں کے نہ ملنے پر مایوسی بھی ہوئی لیکن جو دستیاب ہو چکی تھیں وہ بجائے خود اتنی تھیں کہ ان کو پڑھ کر مناسب حال ادب پاروں کا انتخاب کرنا مشکل معلوم ہونے لگا۔ اس کے علاوہ یہ اندیشہ بھی ہوا کہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔ یہ دشواریاں اس طرح ہجوم کر کے اس شکل میں آئیں کہ بڑی خوشی اور آسانی سے ہمت ہار بیٹھا! اور اسی آسانی سے یہ بھی یقین کر لیا اور خوش ہوا کہ اپنی ہی یونیورسٹی کا اردو کا کوئی اچھا طالب علم اس کام کو شوق، محنت اور قابلیت سے مجھ سے کہیں بہتر طور پر انجام دے گا۔

یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مولوی صاحب طالب علموں کو بہت عزیز رکھتے تھے، اکثر ان کے پیچھے دوستوں سے بگاڑ کرنے میں تامل نہ کرتے۔ مولوی صاحب اردو میں جدید تحریکات و تجربات کرنے والوں میں اس وقت بھی نوجوانوں سے زیادہ نوجوان تھے جب بوڑھوں میں بھی ان جیسا مشکل سے ملتا تھا۔ جدید کے محرکات کچھ ہی ہوں مولوی صاحب کو اردو کے لئے نفع ہی نظر آتا تھا۔ جوانی اپنے اوپر بڑھاپے کا کوئی حق نہیں تسلیم کرتی لیکن مولوی صاحب جیسے بوڑھے کا حق نوجوان کی آئندہ نسلوں پر ہمیشہ رہے گا۔ بات وہی ہے جو پہلے عرض کر چکا ہوں یعنی مولوی صاحب نوجوانوں سے زیادہ نوجوان تھے، تخیل میں، عزم میں، عمل میں۔ اس لئے ماتم اس کا اتنا نہیں ہے کہ مولوی صاحب رحلت فرما گئے بلکہ اس کا ہے کہ وہ نوجوانی میں ہم سے جدا ہو گئے۔

اس بنا پر یہ امید کرنا کہ مولوی صاحب کے نام اور کام کو روشن کرنے اور پرکھنے کے لئے طالب علم سامنے آئیں گے، بے جا نہیں ہے!

"تری یاد کا عالم"

جگر صاحب وہاں پہنچ گئے جہاں ایک نہ ایک دن ہر اُس متنفس کو پہنچنا ہے جو زندگی مرض الموت میں گرفتار ہے، اس دنیا میں موت بھی کتنی سستی یقینی ہر جگہ ہر وقت آسانی سے مل جانے والی چیز ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہوا، پانی، آگ اور مٹی کی طرح یہ بھی ہر جاندار کے لئے کتنی ضروری ہے!

فطرت بہت سے معاملات میں کسی نہ کسی شرط پر انسان سے خوش وناخوش مفاہمت کر لیتی ہے، صرف موت کے مسئلے پر آج تک کسی طرح کی مصالحت پر تیار نہیں ہوئی۔ انسان اور موت کے دیرینہ رشتے و روایات کو دیکھتے ہوئے یہ امر بھی یقینی ہے کہ ارضی سطح پر آئندہ کبھی مفاہمت نہ ہو سکے گی۔

لیکن اگر انسان موت کو تسخیر نہیں کر سکا ہے تو موت کبھی انسان کے ان کارناموں کو نابود یا بے نور نہیں کر سکی ہے جو موت سے زیادہ عجیب و عظیم مانے گئے ہیں۔ وہ انسان کو تسخیر بھی کر سکتی ہے جب انسان سوا ازلی و ابدی ہونے کے ان صفات سے بھی کسی نہ کسی درجے میں متصف ہے جو خدا کے ہیں جن کے طفیل وہ اس سرزمین پر خدا کا نمائندہ اور نائب ہے اور کیا معلوم بعض

تو یہاں تک کہتے ہیں کہ انسان خدا میں ازلی اور ابدی بھی ہے۔

موت مامور و مجبور ہے۔ وہ کتنا ہی چاہے، اپنے کو بدل نہیں سکتی۔ انسان کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ توفیقِ الٰہی اور استعدادِ انسانی کے مطابق اپنے کو بہتر و برتر بنا سکتا ہے۔ لامتناہی حد تک بہتر و برتر! موت کی یہ شکست مسلّم ہے۔ اگر ہم اس طرح سوچنے کا حوصلہ کر سکیں تو محسوس ہوگا کہ انسان موت کے ہاتھ میں کھلونا نہیں ہے۔ ہم میں ایسے اکابر گزرے ہیں، آج بھی موجود ہیں اور آئندہ بھی آتے رہیں گے، جن کے ہاتھ میں موت کی حیثیت کھلونے کی رہی ہے اور رہے گی۔ بڑا انسان اپنی شکست میں زندہ رہتا ہے۔

لیکن اس وقت مرحوم کی وفات سے (کسی عزیز کو پہلی بار مرحوم کہہ کر یاد کرنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے) اُن ساتھیوں اور صحبتوں کی کیسی کیسی یاد تازہ ہو رہی ہے جن سے کبھی اپنی، کبھی اُن کی، کبھی دوستوں کی زندگیاں خوشی سے معمور اور امنگوں سے لبریز رہا کرتی تھیں، کہیں گہری، کہیں ہلکی، یہ یادیں ماضی کے ۳۰، ۳۵ سال کی وسیع دھوپ چھاؤں پر محیط ہیں۔ جگرؔ صاحب کو میں نے ہر حال میں پایا ہے لیکن کبھی ایسا نہیں دیکھا کہ اس کے بیان کرنے میں مصلحت تامّل کرے۔ غفلت میں چاہے وہ بیماری سے ہو چاہے شراب سے، تنگدستی و درماندگی کا سابقہ ہو یا ثروت و شہوت کا نشہ، انسان کی زبان سے بعض ان غیر مستحسن جذبات اور خیالات کا اظہار ہو ہی جاتا ہے جو اس کے تحت شعور میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جگرؔ صاحب ان تمام مراحل سے ثابت قدم گزرے۔ ادنیٰ لوگوں میں ادنیٰ درجے کی تیز و تند شراب کثرت سے پی کر مدہوش ہو جانا لیکن زبان سے کسی ناسزا کلمے کا نہ نکلنا معمولی بات نہیں ہے۔ جگرؔ صاحب پر تھوڑی سی اور ہلکی شراب پی لینے کا اثر بہت جلد اور معمول سے زیادہ ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے اس شخص کے بطون میں کوئی چور دروازہ ہی نہ ہو جس سے

کوئی ناروا خیال یا خواہش داخل ہو جائے یا اس طرح کا کوئی خیال یا خواہش پہلے سے جاگزیں ہو تو موقع پاکر باہر نکل آئے، یہ صفت کم لوگوں میں ملے گی!

ہندوستان اور دوسرے ممالک کے بڑے شاعر اور فن کاروں کو ہم میں سے بہتوں نے دیکھا ہو گا یا ان کے حالات سُنے اور پڑھے ہوں گے، باوجود اس کے کہ ان کا کلام مدتوں سے اشتیاق و احترام سے پڑھا سُنا اور سراہا جاتا ہے ان میں ایسے بھی ہیں جن کی سیرت و شخصیت جہاں تہاں سے داغدار ہے۔ لیکن ان شعراء اور فن کاروں کی عظیم الشان شخصیت کی منزلت اتنی بڑھ چکی ہوتی ہے کہ ان کی سیرت کی خامیوں کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے، ہمارے کتنے بڑے شاعروں کی بعض کمزوریوں کو اُجاگر کرنے کی کیسی کیسی کوشش کی گئی اور اب بھی کرتے رہتے ہیں لیکن ان کی بڑائی میں مطلق فرق نہ آیا البتہ یہ ضرور دیکھتے ہیں کہ شاعر اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے قابو میں چلا گیا یا بعض تقاضوں کے پیشِ نظر اس نے ان صلاحیتوں کو اپنے قابو میں رکھا۔ بصورتِ اوّل وہ ہمدردی کا، بصورتِ دیگر ستائش کا مستحق ہوتا ہے۔

ان کے مقابلے میں یہاں اپنے ان چار غزل گویوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو اب تک اس صدی میں جدید اُردو غزل کی خوبصورت مستحکم اور ایک طور پر کثیر المقاصد، عمارت کے چار عظیم معمار مانے جاتے ہیں یعنی حسرتؔ، اصغرؔ، فانیؔ اور جگرؔ۔ ان کا شعری یا سکونتی تعلق کسی "دلی، صفاہان یا سمرقند" سے نہیں تھا۔ ذرا دور سے اور بلندی پر جاکر دیکھیں تو یہ معلوم ہو گا کہ فیضان سرسیدؔ، ان کے رفقائے کرام اور علی گڑھ تحریک کا ہے۔ علی گڑھ نے شعر و ادب کے جغرافیائی دبستان ختم کر دیئے۔ ان چاروں نے نہ تو کوئی مینوفیسٹو شائع کیا، نہ زندگی و ادب کے اسرار و معارف کو الم نشرح کرنے کے لئے کوئی عالمی کانفرنس منعقد کی نہ تشہیر و تبلیغ کا کوئی ادارہ یا محاذ قائم کیا، نہ جلسے جلوس سے کوئی واسطہ رکھا صرف

جہاں تہاں مشاعروں میں اپنا کلام سُناتے رہے، ایسے مشاعروں میں بھی جہاں شعرا اور سامعین دونوں کی آبرو خطرے میں رہتی ہے۔ بایں ہمہ اُنھوں نے اُردو غزل گوئی کی اس طرح تطہیر و توسیع کی اور اس کو ایسا ترفع بخشا اور زندگی و ادب کے صالح تقاضوں کے پیشِ نظر اس میں توانائی اور دل آویزی پیدا کی کہ اس کے سامنے اُردو شاعری کی دوسری اصناف ماند پڑ گئیں۔ یہ کم عجیب بات نہیں ہے کہ یہ شعرا اپنی اعلیٰ تخلیقات ہی نہیں بلکہ اعلیٰ سیرت و شخصیت کے اعتبار سے کم و بیش نصف صدی تک باوجود طرح طرح کے موانع کے یکساں طور پر ممتاز و محترم رہے!

غزل کی یہ مقبولیت موسمی، مقامی یا اتفاقی نہ تھی جیسی فلمی گانوں کی ہوتی ہے جو بالعموم ادنیٰ طبقے کے نوجوانوں، ہر طبقے کی عورتوں اور گلی کوچے میں پھرنے والے کس مپرس نادان بچوں یا ان طالب علموں کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں جو خاندان کی روایات سے بے بہرہ، سوسائٹی کی ذمہ داریوں سے ناآشنا ماحول کی خرابیوں کے شکار اور اچھی تعلیم و تعلیم گاہوں کے فیض سے محروم ہوتے ہیں۔ ان چار درویشوں نے سیاست کے سستے نعروں سے بھی اپنی دکان نہیں سجائی تھی لیکن ان کا کلام خواص و عوام کے دلوں میں گھر کر لیتا تھا اور اثر دکھاتا تھا۔ بیسویں صدی کے پہلے نصف میں جب طبائع پورے طور پر سیاست اور سائنس کی گرفت میں آچکی تھیں اور پُرانی قدروں کا احترام برائے نام باقی رہ گیا تھا، جب دور و نزدیک یکساں ہو گئے تھے، غزل کو ایسی آبرو بخشی کہ وہ دوسرے ملکوں کے شعر و ادب کے سامنے اپنا سر اونچا رکھ سکے۔ اور ہم میں جو صدیوں سے محکوم و منکوب تھے۔ احساسِ کمتری نہ پیدا ہونے دے۔ ان شاعروں کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ان کا یہ تصرف اس صنفِ کلام پر تھا جو بہت تنگ و محدود اور بعض حلقوں میں نامسعود سمجھا جانے لگا!

مجھے جگر صاحب کے خاندان کا حال نہیں معلوم، کتنی تعلیم تھی، کسی بزرگ

کے مرید یا کس سلسلۂ طریقت یا مسلک سیاست سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طرح کی باتوں میں سے کسی کا علم نہیں۔ جس سے جتنا قریب ہوتا ہوں اتنا ہی اس کے بارے میں ان باتوں کی کھوج لگانے سے پرہیز کرتا ہوں۔ مرحوم کی رحلت سے آج بڑا پُرانا گہرا اور مخلصانہ رشتہ ٹوٹ گیا۔ عمر کی جس منزل پر ہوں وہاں اس طرح کے رشتے ٹوٹتے ہی رہتے ہیں۔ فطرت کا یہی تقاضا ہے لیکن کیا کروں فطرت کے اس طرح کے تقاضے تسلیم کرنے سے دل دماغ عاجز و قاصر رہتے ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ میرے اس قصور میں اور کتنے بدنصیب شریک ہوں گے۔؟

مدّتِ حیات کا حساب کتاب سال اور ماہ کے گزرنے سے نہیں کرتے، عزیزوں کی مفارقت سے بھی کرتے ہیں، وہ اٹھا لئے جاتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ زندگی ختم ہوگئی۔ عمر چاہے جہاں تک پہنچے۔ عمر پانے کو زندہ رہنا نہیں کہتے۔ زندگی اپنی زندگی سے اتنی عبارت نہیں ہوتی جتنی عزیزوں کی زندگی اور خوشی سے ہوتی ہے۔ یہ نہیں تو زندہ رہنا اور نفس کے مطالبے پورے کرتا رہنا ایک مسلسل بے غیرتی اور بڑھتی ہوئی تنہائی اور تاریکی ہے جس کو نہ چھپا سکتے ہیں، نہ اس سے چھٹکارا حاصل کرتے ہیں اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اسے حق بجانب بھی نہیں قرار دے سکتے۔

جگر صاحب میرا بہت لحاظ کرتے تھے۔ اصغر گونڈوی مغفور کے علاوہ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن کے لئے وہ اتنا اخلاص و احترام ملحوظ رکھتے ہوں جتنا میرے لئے۔ اصغر صاحب سے تو ان کی عقیدت بندگی کی حد تک پہنچی ہوتی تھی۔ شاید ہی وہ کسی اور کے یہاں اس محویت و مسکنت کے عالم میں پائے گئے ہوں جتنا اصغر صاحب کے "حضور" میں، اصغر صاحب بھی مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ جگر صاحب کی مجھ سے وابستگی یہیں سے شروع ہوئی

تھی جس کو آخر وقت تک اُنھوں نے جس طرح نباہا اُس کا خیال کرتا ہوں تو دل عجیب عجیب طرح سے بے قرار ہونے لگتا ہے!

جگر صاحب کے اس خلوص و محبّت کو میں نے نباہنے کی برابر کوشش کی لیکن مرحوم ان غیر معمولی شریف اور فیاض انسانوں میں تھے جن کی مسلسل "نوازشہائے پیدا و پنہاں" کا ساتھ دینے سے ہمیشہ قاصر رہا۔ روپے پیسے، مال و متاع سے سلوک کرے تو اس کا بدلہ ادا کر دینا آسان ہے لیکن جو شخص (وہ جگر صاحب جیسا شخص) محبّت و احترام کی بیکراں نعمتوں سے کسی کو بہرہ مند کرے اور رکھے اور کسی وقت غافل نہ رہے، اس سے کون عہدہ برآ ہو سکتا ہے! جگر صاحب کے پاس جو دولت تھی اور جسے وہ مجھ پر بے دریغ صرف کرتے تھے اس سے مبادلہ کے لئے میری ہر دولت ناقابلِ التفات تھی۔

جگر صاحب کی محبّت بھی عجیب محبّت تھی۔ ہمیشہ اس فکر میں رہتے کہ میں ان کی مدارات میں کوئی حصہ نہ لوں۔ اس خیال سے کہ مجھے زحمت نہ ہو۔ اس سبب سے ایک طور پر میں جگر صاحب سے اتنا اور اس طرح قریب نہ ہو سکا کہ ان کی ذہنی واردات اور رنج و راحت کے محرکات سے براہِ راست اور پورے طور پر واقف ہو سکتا۔ اس سے شرمندہ ہوں۔ عقیدت و محبّت کا پورے طور پر مستحق نہ ہوتا لیکن اس کا مورد رہنا شریف آدمی کے لئے اتنا ہی باعثِ خلش رہتا ہے جتنا ایک گناہگار کے لئے جو اس اندیشے میں مبتلا رہتا ہے کہ کہیں بے نقاب نہ ہو جائے۔ یاد نہیں آتا اُنھوں نے اپنی تکالیف یا نجی دشواریوں کا کبھی کسی عنوان سے مجھ سے تذکرہ کیا ہو۔ مشاعروں میں ان کے کلام کو جس خلوص سے سراہا جاتا اور خود ان کی پذیرائی جس عزّت و محبّت کے ساتھ کی جاتی اس کا ذکر بھی ان کی زبان پر نہیں آیا۔ ایسے شعرائے بھی واقف ہوں جن کے کلام سے مشاعروں میں دھوم مچ

جاتی اور ان کا کلام سُننے کے لئے لوگ سراپا شوق و انتظار ہوتے لیکن فرق یہ ہوتا کہ سامعین جگرؔ صاحب کی موجودگی سے اور ان کو دیکھ کر جتنے خوش ہوتے اور فخر کرتے دوسروں کی موجودگی سے نہیں۔ آخر آخر میں معذوریوں کے سبب سے وہ اپنا کلام اچھی طرح سُنا بھی نہیں سکتے تھے، جب بھی لوگ خوش ہوتے کہ جگرؔ صاحب نے ان کے لئے مشاعرے میں شرکت کی زحمت گوارا کی، اُنھوں نے جگرؔ صاحب کو دیکھ لیا اور ان کا کلام ان کی زبان سے سُن لیا۔ یہ امتیاز اس صدی میں اُردو کے شاید کسی غزل گو کو نصیب نہیں ہوا!

جگرؔ صاحب سے لوگوں کو جیسے مذہبی ارادت و عقیدت ہو۔ میر انیسؔ اور اقبالؔ سے اس طرح کی شیفتگی تو سمجھ میں آتی ہے۔ جگرؔ صاحب سے اس شغف کو کس چیز پر محمول کروں۔ ان کے یہاں مذہب، سیاست، اخلاق، فلسفہ، تصوّف، طنز و ظرافت کسی کو بھی تو دخل نہیں، ابتدائی عہد کے کلام سے قطع نظر عشق و عاشقی کا بھی وہ رنگ نہیں ملتا جو عام طبائع کے لئے باعثِ کشش ہوتا ہے۔ پھر اس کے سوا اور کیا کہوں کہ ان کے کلام ہی میں "ماورائے سخن ایک بات" نہ تھی، ان کی شخصیت میں ماورائے شخص بھی ایک بات تھی۔

جگرؔ صاحب بحیثیت مہمان تشریف لاتے تو بیک وقت کتنی خوشگوار باتوں کا احساس ہونے لگتا گویا کوئی بھولی ہوئی لطیف خوشبو آگئی ہو۔ زندگی کی نعمتیں اچھی، اس کے مصائب گوارا اور آلودگیاں قابلِ احتراز معلوم ہونے لگتیں۔ جگرؔ صاحب کے چاہنے والے دو ایک دن پہلے سے گھر کا چکّر لگانے لگتے تھے۔ وہ آجاتے تو دن رات ان کو گھیرے رہتے۔ جگرؔ صاحب کے اس "حلقے" یا "دربار" میں میں کبھی مخل نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسے جانتے تھے۔ اس لئے جب ہجوم ختم ہوجاتا تو صرف یہ اطلاع بھجوادیتے کہ ملاقاتی رخصت ہوگئے، میں پہنچتا تو جیسے سر سے پاؤں تک فرطِ تکریم و

تشکر سے جگمگانے لگے ہوں، بے اختیار کھڑے ہو جاتے اسی بے اختیاری سے فوراً بیٹھ جاتے، جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔ پھر اُٹھ کھڑے ہوتے اور آس پاس کی چیزیں بے ضرورت اِدھر اُدھر رکھنے لگتے۔ بیٹھ جاتا تو وہ بھی بیٹھ جاتے اور مسکرانے لگتے جیسے اپنے اس مسکرانے کی شمیم و شبنم کے تختِ رواں پر مجھے بٹھا دینا چاہتے ہوں۔!

جگر صاحب شکل و صورت کے اچھے نہ تھے لیکن اس وقت ان کا مسکرانا اور کبھی رہ رہ کر ہنس پڑنا اور جلد ہی کچھ کہنے لگنا تاکہ میں ان کے اس اضطراب و انبساط کو جان نہ سکوں، ایسا دل نشین اور قابلِ فخر و احترام محسوس ہوتا کہ میں اس وقت اس کو کسی تشبیہ و استعارے سے بھی واضح نہیں کر سکتا، یہاں تک کہ اس کو کسی حسین دوشیزہ یا معصوم تندرست بچّے کے مسکرانے اور ہنسنے سے بھی تشبیہ دینا ناکافی سمجھتا ہوں۔ جگر صاحب اچھی صورت کے ہوتے تو شاید اتنے اچھے معلوم نہ ہوتے، جگر صاحب ہی پر موقوف نہیں کوئی اور بھی ہوتا تو اتنا دلآویز نہ معلوم ہوتا۔ سیرت کا حُسن دنیا کے تمام دوسرے حسن سے افضل ہوتا ہے۔ یہ بات جتنی سچّی اور پکّی ہے۔ افسوس ہے کہ اتنی ہی دیر میں اور کبھی کبھی وقت نکل جانے پر اس کا احساس اور یقین ہوتا ہے۔

جگر صاحب جیسے مذہبی آدمی تھے اتنے ہی اخلاقی بھی! ایسا ہونا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا بظاہر معلوم ہوتا ہے بالخصوص ایسے لوگوں کے لئے جو اصلاً نہیں اصطلاحاً مذہبی ہوتے ہیں، ہر مذہبی آدمی اخلاقی آدمی نہیں ہوتا۔ خود غرض یا ناواقف مذہب کو بالعموم اصطلاحی حدود میں مقید رکھتے ہیں۔ اسی طرح بعض دوسرے اخلاق کو مذہب سے آزاد اور علیحدہ سمجھتے ہیں۔ مذہب اور اخلاق کو علیحدہ خانوں میں رکھا نہیں جا سکتا اس لئے حقیقتاً اخلاق مذہب سے برآمد ہوا

ہے اور اس کا آوردہ و پروردہ ہے۔ اخلاق مذہب کی عملی شکل ہے، مذہب سے علیحدہ ہو کر اخلاق پر زور دینا ان لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے جن کی نیت بالعموم بخیر نہیں ہوتی۔ مذہب اخلاق کا محافظ و محتسب ہے اور اخلاق بغیر مذہب، عورت بغیر شوہر ہے!

خود غرض طبائع مذہب کی ہمہ گیر و ہمہ وقت گرفت سے بچنے کے لئے اخلاق کے دائرے میں پناہ لیتی ہیں۔ جس کی سرحد پھاند کر تہذیب کی قلمرو میں آجاتے ہیں۔ وہاں سے سیاست کی وادی میں پہنچتے ہیں۔ سیاست سے قومیت اور تجارت کی منزلیں دُور نہیں رہ جاتیں۔ یہیں پہنچنا بالعموم ان کا مقصد ہوتا ہے۔ مذہب کے تقاضوں سے بچنے یا مذہب کی بلندی سے اُترنے کے لئے جو زینے ہیں ان میں پہلا اخلاق پھر تہذیب، اس کے بعد سیاست، قومیت اور تجارت ہیں۔ مؤخر الذکرین کا نامسعود اتحاد آج عالمِ انسانیت کا سب سے بڑا آشوب ہے!

مذہبی ہونے کا علمی و کتابی تصوّر واضح کرنے کے لئے خاص طرح کی لیاقت درکار ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔ اپنے طور پر پابندی کر پاتا ہو یا نہیں کوئی ایسی بات سُننا اور دیکھنا گوارا نہ کر سکے جو خدا اور اس کے رسولؐ کے خلاف کسی کے منہ سے نکلے یا جس سے شعائرِ اسلام کی سُبکی ہوتی ہو۔

بہت دنوں کی بات ہے علی گڑھ میں طالب علمی کا زمانہ تھا۔ احباب کی ایک صحبت میں ہر طرح کی باتیں بے تکلفی سے ہو رہی تھیں۔ ایک دوست موجود تھے جو مسلمان کہلاتے تھے لیکن خدا رسولؐ اور احکام دین کے قائل نہ تھے۔ ایک دوسرے صاحب بھی تھے جو ہم میں اپنی اوّل جلول حرکتوں اور بھولے پن کے لئے باعثِ تفریح رہا کرتے تھے۔ گفتگو کے دوران میں پہلے کی زبان سے مذہب کے بارے میں کچھ استہزائیہ کلمے نکل گئے۔ باؤلا برافروختہ ہو کر کھڑا ہو گیا، کہنے لگا توبہ کرو

اور معافی مانگو نہیں تو تمہاری خیر نہیں! اُنھوں نے سٹ پٹا کر کہا تم بھی تو اسی طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ کچھ جوش میں آ کر کچھ رو کر باؤلے نے جواب دیا میری بات اور ہے خدا رسولؐ تو میرے ماں باپ بھائی بہن ہیں میرے جو جی میں آئے گا کہوں گا تیرا تو ان سے کوئی رشتہ نہیں تو میرے سامنے میرے ماں باپ بھائی بہن کی کیسے توہین کر سکتا ہے!

جگرؔ صاحب کا علی گڑھ اور الہ آباد کا وہ زمانہ یاد ہے جب وہ زیادہ تر مخمور اور بد حال رہتے تھے لیکن دین یا ائمۂ دین کے خلاف کوئی فقرہ کان میں پڑ جاتا تو بدمستی کا پورا زور اس پر صرف کر دیتے جس کی زبان سے وہ کلمہ نکلا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے ان پر شراب کے نشے کے بجائے کوئی اور عالم طاری ہو گیا۔ مذہب ان کی نہاد میں تھا جس کا مظاہرہ وہ کبھی کبھی اس طرح کر جاتے کہ بڑی نزاکت کا سامنا ہو جاتا اس سے جگرؔ صاحب نے نقصان اُٹھایا ہو یا نہیں وہ لوگ فائدہ اُٹھا لیتے تھے جن کی نیتوں میں فتور ہوتا۔

کہیں کا سفر کتنا ہی ضروری ہوتا، علی گڑھ سے گزرتے تو وہ ایک دن میرے ساتھ ٹھہرنے کی گنجائش نکال لیتے۔ حج سے واپس آ چکے تھے۔ ایک دن سہ پہر میں چائے پی رہے تھے۔ حسبِ معمول کچھ لوگ جمع ہو گئے تھے، فرمانے لگے۔ مدینہ طیبہ میں ایک دن چائے کی پوری پیالی اوپر آ رہی لیکن کوئی تکلیف نہ ہوئی، اتنا کہہ کر چپ ہو گئے، حاضرین میں سے ایک صاحب بول اُٹھے۔ جگرؔ صاحب فکرِ شعر میں غرق رہے ہوں گے خبر نہ ہوئی ہو گی۔ جگرؔ صاحب نے جواب دیا کیا کیجئے گا آپ کو اس طرح کی تعبیر کی توفیق ہوئی۔ پھر ہنس پڑے اور بولے، پُرانا زمانہ کیا بُرا تھا جب ہر کس و ناکس کو آزادی نہ تھی۔ اس کے لئے معتمد اور منتخب ہی لوگ ہوتے تھے۔

جگر صاحب پر بعض زمانہ بڑی سختی کا گزرا ہے۔ مالی دشواریوں کے سبب سے پریشان رہتے تھے۔ اس کا اظہار اُنھوں نے کسی اور سے کیا ہو یا نہیں مجھ سے کبھی نہیں کیا۔ یہ بڑی آزمائش کا مرحلہ ہوتا ہے۔ سیرت میں کہیں کوئی خامی رہ جاتی ہے تو تنگ دستی میں بالضرور اور بڑی شدّت سے اُبھر آئی ہے معمولی اشخاص کا تو ذکر کیا وہ تو ذرا سے فشار سے بکھرنے لگتے ہیں، اچھے اچھوں کو اس منزل میں ڈگمگاتے دیکھا ہے۔ ایسے زمانے میں بھی جگر صاحب اچھا کھاتے تھے، اچھا پہنتے تھے۔ اچھی طرح خود رہتے تھے، اپنے مہمانوں کو رکھتے تھے کسی پر بُرا وقت آپڑتا تو اپنے اوپر سختی جھیل کر اس کی مدد کرتے۔ اس دورِ ابتلا میں بھی لوگ ان کو طرح طرح سے دھوکہ دیتے اور زیرِ بار کرتے۔ کم لوگ ایسے ہوں گے جن کو دوسروں نے اتنا لوٹا کھسوٹا ہو جتنا جگر صاحب کو، اور ایسے لوگ تو شاید ہی ملیں جو اپنے اس طرح لوٹے کھسوٹے جانے کو خاطر میں نہ لاتے ہوں۔

جگر صاحب کسی کی درخواست کو رد نہیں کر سکتے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ درخواست کرنے والا جھوٹا ہے۔ آخر آخر میں تو نوبت یہاں تک آگئی تھی کہ لوگ مانگنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے تھے جس کا جب جی چاہا جس چیز کو چاہا لے لیا۔ جگر صاحب یہ سب دیکھتے لیکن کسی طرح کا خیال نہ کرتے۔ ایک بار میں نے ذرا تلخ ہو کر پوچھا، جگر صاحب آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ مسکرا کر اور عجیب معصوم انداز میں فرمانے لگے کیا کروں، نہ کسی سے انکار کر سکتا ہوں اور نہ اس کو شرمندہ دیکھ سکتا ہوں۔ میں نے ذرا کم شریفانہ انداز میں کہا، اس کے بعد آپ یہ بھی چاہتے ہوں گے کہ میں آپ کی یا اس کی درازیِ حیات کی دعا بھی مانگا کروں، بڑے مزے سے ہنسے اور جگر صاحب کب نہیں مزے سے ہنستے تھے!

بڑے باوضع آدمی تھے۔ جس سے خلوص کے مراسم ہو گئے تمام عمر کے لئے

اس پر مہر لگ گئی۔ علی گڑھ میں تین چار گھرانے ایسے تھے جن سے عزیزانہ اور دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ آتے تو چاہے کتنے ہی موانع ہوں ان کے گھر ضرور جاتے۔ وہ جس طرح کی فرمائش قبول کر لیتے خواہ اس میں ان کو کتنی ہی تکلیف ہوئی، جہاں جاتے اہتمام سے جاتے، نہا دھو کر، کپڑے بدل کر، کبھی تحفے کے طور پر کچھ لے کر، مدت دراز سے یہ سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ آخر آخر میں جب صحت خراب رہنے لگی تھی تو میں اس طرح کی دید و باز دید سے روکتا۔ ہر طرح کا اہتمام کرنے کے بعد پانوں کی ڈبیا بٹوا لے کر کسی کے ہاں جانے کے لئے تیار ہوتے اور اتفاقاً میں نکل آتا تو ان پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی جیسے کوئی بچہ قصور کرتا ہوا پکڑ لیا جائے۔ منع کرتا تو فوراً مان جاتے، وہ بھی اس طرح جیسے واقعی مان گئے ہوں۔ اندر آجاتا تو تھوڑی دیر بعد اسی اہتمام کے ساتھ اپنی مہم پر روانہ ہو جاتے جیسے بچوں کو کسی کام سے منع کیجئے تو خوش و ناخوش اس وقت تو مان جائیں گے لیکن موقع ملتے ہی وہی کریں گے جو کرنے والے تھے۔ جگر صاحب کا بچوں کا سا یہ انداز بڑا پر لطف معلوم ہوتا تھا بالخصوص اس وقت جبکہ بعد میں بچوں سے بھی زیادہ معصوم یعنی اپنے انداز میں اس کی ٹوٹی پھوٹی معذرت کرتے!

جگر صاحب جانتے تھے کہ بطیب خاطر میں کسی شاعر سے شعر سنانے کی فرمائش نہیں کرتا اور اس بات سے اور زیادہ بدحظ ہوتا ہوں کہ خود شاعر بے تکلف ہو کر یا بادنیٰ اشتعال جس کا مرتکب بھی اکثر وہ خود ہوتا شعر سنانے لگے! اسے آپ میری بدتمیزی پر محمول کریں یا شاعر کی یا دونوں کی کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ بات یہ ہے کہ بعض صوری یا معنوی اعتبار سے (صوری زیادہ معنوی برائے نام) شعر سننے اور داد دینے کے لئے بالعموم میرا انتخاب کیا جاتا ہے اور یہاں یہ حال ہے کہ پورا مصرع درکنار اس کا جزو تک اٹھانے سے ڈرتا ہوں کہ کہیں

الفاظ یا اعراب وغیرہ کا اُلٹ پھیر نہ ہو جائے۔ جب شاعر دوسرا مصرع پڑھتا ہے اور اکثر بار بار اور دیر تک پڑھتا رہتا ہے پہلا بھول چکا ہوتا ہوں، اس لئے پورے شعر کی داد دینے کے لئے طرح طرح کے سامعین کا منہ تکنا پڑتا ہے اور جلد سے جلد فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ان میں کون حلوے مانڈے کی غرض سے آیا ہے، کون میزبان کو ایصالِ ثواب کرنا چاہتا ہے، کون شاعر کو ضرب شدید یا خفیف پہنچانے کا تہیّہ کر رہا ہے اور کون مجھ کو محفل سے باہر نکل جانے کا چیلنج دے رہا ہے۔ اس کے بعد کہیں میرا منہ اس قابل ہوتا ہے کہ شاعر کو دکھا سکوں۔ دوسری اور سب سے بڑی آزمائش یہ ہوتی ہے کہ کبھی کبھی میں شعر سے متاثر ایک طرح ہوں لیکن داد دوسری طرح دینی پڑتی ہے۔ ساتھ ہی ڈرتا بھی رہتا ہوں کہ اس کشمکش میں کہیں مقدّم مؤخر نہ ہو جائے! چنانچہ جہاں کہیں اس کا خطرہ ہوتا ہے کہ شاعر اور اس کے کلام دونوں کی کرامات پر سب سے پہلے مجھے ایمان لانا پڑا پڑے گا اور اعلان بھی کرنا پڑے گا، میں داد دینے والا ساتھ لے جاتا ہوں جس کی مجھے خاصی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ داد دینے والے سے یہ طے رہتا ہے کہ وہ اس طرح داد دے کہ اگر میں دینے لگوں تو کوئی سُن نہ پائے یا دینے والا ہوں تو ہمت نہ پڑے۔

غالباً فروری ۱۹۵۹ء کی آخری تاریخیں تھیں۔ "آتش گل" پر جگر صاحب کو ساہتیہ اکیڈیمی کا انعام ملا تھا۔ جیسا کہ قاعدہ بنا رکھا تھا، دلّی سے واپسی پر میرے ہاں ٹھہر گئے۔ یہ ان کا علی گڑھ میں آخری قیام تھا۔ صحت کافی گر چکی تھی لیکن طبیعت بشّاش تھی، معمولات میں زیادہ فرق نہیں آتا تھا۔ دوستوں کی آمد و رفت، مقررہ گھرانوں پر حاضری، طالب علموں سے ملاقات، بچّوں سے تفریح بدستور تھی، صبح کا وقت تھا، صحن میں دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ خلافِ معمول مجھے اندر

سے بلوا بھیجا۔ آیا تو جگرؔ صاحب کو غیر معمولی طور پر شگفتہ پایا۔ جیسا کہ ان کا قاعدہ تھا مسکرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہی سر سے پاؤں تک شوق و شیفتگی کا عالم۔ کچھ رُکے۔ پھر بے اختیار بول پڑے۔ آج میں نے آپ کو تکلیف دینے کی جرأت کر ہی ڈالی۔ میں نے کہا، جگرؔ صاحب، اچھا کیا مجھے بھی تو یہ کہنے کا فخر حاصل ہوا کہ آپ نے بلا بھیجا۔ خوش ہو گئے۔ میں بیٹھ گیا۔

جگرؔ صاحب اچھی طرح جانتے تھے کہ میری طبیعت کچھ دنوں سے خراب رہنے لگی تھی لیکن اُنھوں نے آج نہ پہلے کبھی یہ پوچھا کہ میں کیسا ہوں کیا کرتا ہوں کیا کرنا چاہیئے، بچے کہاں ہیں کیا کرتے ہیں کس کی شادی ہوئی ہے کس کی نہیں، کون پاکستان میں ہے کون ہندوستان میں، کتنے بے روزگار ہیں کتنے نہیں، مشیّتِ الٰہی یا حکومت کی پالیسی کیا تھی جس پر مجھے صبر کرنا چاہیئے یا بغاوت، جیسا کہ اس طرح کی باتیں ملاقات کے وقت کے لئے لوگ عموماً حفظ کر رکھتے ہیں۔ وہ صرف مجھے دیکھ کر اس طرح خوش ہو جاتے جیسے یہ تمام باتیں پوچھ لیں اور مطمئن ہو گئے اور مجھے مبارک باد دے ڈالی۔

یاد نہیں آتا کہ کون کون سی غزلیں سُنائیں۔ اس صبح کو اُنھوں نے جس درد اور وارفتگی سے اپنا کلام سنایا اس سے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ آج میری تمام عمر کی محبت کا صلہ دینے کی کوشش کر رہے ہوں جس سے بڑا صلہ ان کے پاس دوسرا نہ ہو۔ جیسے سب سے بے تعلق ہو کر میرے لئے اپنے کو اپنے ہی نغمے میں ضم اور ختم کر دینا چاہتے ہوں! سُنانا ختم کرتے ہی مسکرا کر اور بات چھیڑ دی۔ جیسے یہ سنانا کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا اور یہ سب محض اس احتیاط کے پیشِ نظر کہ اگر اس کا کوئی غمگین اثر مجھ پر ہُوا تو جلد سے جلد زائل ہو جائے!

اس وقت یہ بحث پیشِ نظر نہیں ہے کہ ہمارے شعراء مشاعروں میں لحن سے

پڑھتے ہیں تو اچھا کرتے ہیں یا بُرا یہاں تو صرف جگر صاحب کے پڑھنے کا سوال ہے، بعض اصحاب، مرحوم کے کلام کی تاثیر کو کبھی کبھی ان کی خوش الحانی پر محمول کرنے لگتے ہیں لیکن مجھے ان کی آواز اور پڑھنے کا انداز ہمیشہ ان کے کلام کا جُزء معلوم ہوئے۔ مرحوم کے کلام اور پڑھنے کے اندازو آواز میں غیر معمولی ہم آہنگی ملتی تھی جیسے ع

بے جام ظہور بادہ نہیں، بے بادہ فروغ جام نہیں

یاد آتا ہے کہیں میں نے اس طرح کی بات لکھی ہے کہ اصغرؔ گونڈوی مرحوم کے کلام کو پڑھتا ہوں تو اصغر صاحب سامنے آجاتے ہیں اور اصغرؔ صاحب کا تصوّر کرتا ہوں تو ان کا کلام یاد آنے لگتا ہے۔ جگرؔ صاحب کا کلام ان کی آواز ہے اور ان کی آواز ان کا کلام! کہیں یوں بھی سُنا ہے کہ آواز کلام اور کلیم ایک ہی مانتے ہیں!

جگرؔ صاحب کے جذبات تیز و تند تھے، اسی اعتبار سے وہ سریع الحس بھی تھے۔ کوئی واردات ہو خارجی یا داخلی، دور ہو یا نزدیک شخصی ہو یا اجتماعی اسے بہت جلد اور بڑی شدّت سے محسوس کرتے تھے۔ یہ بات دوسرے شاعروں میں بھی مل سکتی ہے لیکن اکثر اس فرق کے ساتھ کہ جذبات کتنے ہی تیز و تند ہوں جگرؔ صاحب کے شریفانہ، شاعرانہ تصرّف سے وہ اپنی قباحتیں اور کثافتیں کھو دیتے ہیں، زور قائم رہتا ہے اور اثر بڑھ جاتا ہے۔ اعلیٰ اور ادنیٰ شاعر میں اکثر اس طرح بھی امتیاز کرتے ہیں کہ کس کے یہاں کوئی چیز کیا بن گئی۔ اعلیٰ اسفل میں جا گرا یا اسفل کو اعلیٰ کی طرف رہبری ملی۔

شاعر کے ظرف و ذوق کا صحیح اندازہ لگانے کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ وہ عورت اور متعلقہ جذبات کا کس طرح اظہار کرتا ہے۔ وہ عورت کو جسم کی لذّت کا

صرف ایک وسیلہ سمجھتا ہے یا اس کو ایک قدرِ اعلیٰ اور ایک ذمّہ داری بھی مانتا ہے۔ جگرؔ صاحب کے محرکاتِ شعری میں عورت کا عمل دخل کم نہیں ہے لیکن اُتنا ہی عورت کا احترام اور اس سے عشق کا ارتفاع بھی ملتا ہے۔ یوں بھی وہ کسی جذبۂ فکر یا خیال کو مرتفع کیے بغیر نہیں پیش کرتے۔ شاعری اور شاعر دونوں کی بڑائی اسی میں ہے۔ بعض شاعر ہر طرح کے جذبات و خیالات کو جوں کا توں پیش کر دینا شاعری کا تقاضا سمجھتے ہیں، یہ ان کی بھول یا بددیانتی ہے۔

ضمناً یہاں ایک بات کا اظہار کر دینا چاہتا ہوں۔ ہمارے شعراء اور افسانہ نگار ایسے ہیں جن کی فنی چابکدستی میں شبہ نہیں لیکن وہ اپنے جذبات و واردات کو ظاہر کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیتے اور اس کو اپنی خامی نہیں شاعری کا تقاضا قرار دیتے ہیں۔ شہوت، غصّہ، نفرت، خود نمائی کے جذبات بڑے منہ زور ہوتے ہیں اور کم و بیش ہر انسان میں ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی غلط نہیں ہے کہ حیوان اور انسان میں فرق بھی ہے کہ حیوان ان پر قابو نہیں رکھ سکتا لیکن انسان ان کو بس ہی میں نہیں رکھتا بلکہ ان کو بہتر مقاصد اور بہتر شکل میں ڈھال دیتا ہے۔ وہ محسوس تو حیوان ہی کی طرح کرتا ہے لیکن اظہار انسان کی مانند کرتا ہے، جو محسوس کرے اسی کو ظاہر کرے قرینِ فطرت یقیناً ہے قرینِ انسانیت نہیں ہے۔ اپنی خامی کو شاعری کا تقاضا سمجھنا نالائقی کی علامت ہے۔ انسان کا انا الحق کہنا ایسا غلط نہیں ہے۔ تلاشِ معرفت میں بعض فقرا یا صوفیا پر یہ واردات طاری ہوئے ہیں لیکن ان واردات اور ان کے اظہار کو دلیل کم نظری و کم ظرفی قرار دے کر کہنے والے کو قتل کر دیا گیا ہے۔

سوا الہام کے جو خدا کی طرف سے صرف اس کے رسول پر نازل ہوتا ہے اور رسول اس کو بجنسہٖ اُمّت کو پہنچا دیتا ہے، کوئی ایسا خیال نہیں ہے جو شاعر

کے دل میں آتا ہو اور وہ اس میں حسبِ ضرورت تصرف کئے بغیر ہم تک پہنچا دیتا ہو۔ یہ تمام تر شاعر کے ذوق اور ظرف پر منحصر ہے کہ وہ اس خیال کو کس مقصد سے کس شکل میں ہم تک پہنچاتا ہے۔ اگر وہ سرشت کا اچھا، فن سے واقف، زبان کا رمز شناس ہے، کہنے کا سلیقہ رکھتا ہے اور صحیح موقع و محل کو پہچانتا ہے تو اس کی بات مؤثر، مفید اور دیرپا ہوگی۔ اگر اس میں یہ صفات نہیں ہیں تو یہ شاعری نہیں کچھ اور ہوگی جس کو آپ شاعر کی نارسائی یا نالائقی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ شاعر ڈاک خانہ، تار گھر، ریڈیو نہیں ہوتا جو صرف خبر رسانی کا کام انجام دیتے ہیں۔ وہ فن کار اور معلّم کی حیثیت سے حسن و صداقت کا داعی ہوتا ہے۔ اردو شاعروں کی فہرست پر نظر ڈالئے اور ہر شاعر کے کلام کی عمر اور انجام کو اس پیمانے سے ناپ لیجئے۔ یوں دنیا میں کوئی نالائق یا نالائقی ایسی نہیں ہے جس کے لئے کوئی سندِ جواز نہ تصنیف کی جا سکے۔

جگرؔ، اصغرؔ اور فانیؔ ان سرآمد غزل گویوں میں ہیں جن کا کلام ان مخصوص صحبتوں میں بھی بے تکلف پڑھا اور لطف سے سُنا جا سکتا ہے جہاں رند، پارسا، خورد و بزرگ، ماں، بیٹیاں، بہن بہو بیوی بیک وقت موجود ہوں اور محفل ثواب کمانے کے مقصد سے نہیں تفریح و انبساطِ خاطر کے لئے منعقد کی گئی ہو۔ آج اس طرح کی بات کسی شاعر کی بڑائی میں بیان کرنا خود مجھے اپنے کانوں کو اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے اسے مضحکہ خیز بھی سمجھیں تو کیا عجب! ان میں جگر صاحب کو ایک گونہ اس لئے فضیلت حاصل ہے کہ وہ اپنے ان ساتھیوں سے زیادہ جذبات کی بعض نزاکتوں کو اپنے کلام میں جگہ دیتے ہیں۔

فانیؔ کا جہان ہی دوسرا ہے۔ ان کے ہاں اس طرح کی دشواریاں پیش نہ آتی ہوں تو کوئی تعجب نہیں۔ وہ سر تا پا الم ہیں لیکن اتنے غمگین شخص نہیں ہیں جتنے

غمگین شاعر ہیں غم کا ذکر انھوں نے جس رکھ رکھاؤ سے کیا ہے اس سے غم، غم نہیں رہا ایک اندازِ فکر، آرٹ یا عبادت بن گیا، ان کے ہاں غم کا انداز بین و بکا کا نہیں عرفان و ایقان کا ہے۔ بڑھی ہوئی داخلیت کے سبب سے کہیں کہیں وہ الفاظ کے اُلٹ پھیر سے بھی کام لیتے ہیں لیکن یہ شعوری اور شاعرانہ ہوتا ہے اس لئے ذوق پر بار نہیں ہوتا، اکثر اس کی سیرابی کا باعث ہوتا ہے۔

اصغرؔ کے لہجے میں جیسی شائستگی و شگفتگی، جذبات و افکار کی جو تازگی و تہذیب ملتی ہے تیز رشستہ منتخب اور مترنّم الفاظ و ترکیبیں جو مفہوم اور معانی کو زیادہ حسین و دلنشین کر دیتی ہیں بجائے خود ایسے عوامل ہیں جو غیر صالح خیالات و جذبات کے اظہار کے منافی ہیں۔ اصغرؔ کے یہاں عورت، تصوّف، عاشقی اور سیاست کا وہ "روزمرّہ اور محاورہ" نہیں ملے گا جسے عام طور پر دوسرے شعرا کبھی کبھی "رسمِ پابندیٔ اوقات" کے طور پر کام میں لاتے ہیں لیکن ان کے کلام میں ان سب کی بڑی دلکش جانی پہچانی، اکثر چونکا دینے والی تصویریں اور تعبیریں ملیں گی! ان پر اور ان کی شاعری پر خود ان کا شعر گواہ ہے جس میں اُنھوں نے کہا ہے کہ بادِ صبا چمن میں غنچہ و گل کو کس مزے سے چھیڑتی ہے۔ لیکن اس کی پاک دامانی پر حرف نہیں آتا!

معتبر شاعر وہ ہے جو تمام علوم "سینہ و سفینہ" کے اسرار و رموز سے کماحقہٗ واقف ہو یا نہ ہو، اس سے آشنا ہو کہ فلاں خیال، جذبہ یا فکر پر کس علم کا عمل مناسبِ حال ہو گا، مثلاً کسی خاص خیال کو فنونِ لطیفہ، فلسفہ، تصوّف، اخلاقیات، مذہبیات، کیمیا، طبیعیات وغیرہ میں سے کسی علم و فن یا علوم و فنون کے رمز و رعایت کی رو سے سلجھا کر توانائی دے کر اور سنوار کر سامعین تک پہنچایا جائے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ مفید و مؤثر ہو۔ یہاں اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ

ہر شاعر علم و فن سے واقف ہو (سب سے زیادہ تو اسے اپنے فرض اور فن سے واقف ہونا چاہیے) کہنا صرف اتنا ہے کہ جو علوم انسان کو فطرت کا راز سمجھنے اور اس سے فائدہ اُٹھانے میں اپنے اپنے طور پر مدد پہنچاتے ہوں شاعر کو ان کا علم ہونا چاہیے، اس کو شاعر کے ان علوم پر قدرت رکھنے سے تعبیر نہیں کریں گے نہ اس کا مطالبہ کریں گے بلکہ ان علوم پر اس کا شاعرانہ تصرّف قرار دیں گے۔ اقبالؔ اس رمز سے خوب واقف تھے، غزل گوئی میں کسی حد تک اصغرؔ مجھے ایسے معلوم ہوئے۔

حسرتؔ عشقِ مجازی کے پہلو اور بے ساختگی کے انداز کو پیش پیش رکھتے ہیں۔ حسرتؔ عشقِ مجازی کے مزاج داں اور محتسب دونوں تھے۔ اتنی حسین رچی ہوئی جیتی جاگتی خارجیت صفِ اوّل ہی کے شعراء میں ملے گی۔ خارجیت کا نباہنا داخلیت کے نباہنے سے زیادہ مشکل اور ذمّہ داری کا کام ہے۔ میرے نزدیک خارجیت اور داخلیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کو جانے بغیر دوسرے کا ہو رہنا نارسائی یا نااہلی کی دلیل ہے۔ خارجیت کے آداب اور موقع و محل سے بے پروا یا بیگانہ رہ کر کاروبار کرنا سطحیت اور سفلہ پن ہے!

جگرؔ صاحب نے حُسن و عشق کے علاوہ سیاسی و سماجی حالات و حوادث پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ سیاسی تاثّرات کو شعوری طور پر غزل کے جام و مینا میں ڈھالنے کی سب سے پہلی اور کامیاب کوشش سہیلؔ نے کی ہے۔ اس میں ان کے پیش رو حسرتؔ موہانی ہیں، لیکن حسرتؔ کی غزلوں میں سیاسی رنگ اتنا داخلی نہیں ہے جتنا خارجی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فکرِ سخن کرتے ہوئے ایک آدھ شعر سیاسی رنگ کے آگئے تو ان کو بھی غزل میں "ڈال دیا"۔ حسرتؔ کی سیاست اور شاعری علیحدہ علیحدہ خیالات میں بنٹی ہوئی ہیں۔ سیاسی شعور کے چھینٹے مولانا محمد علی جوہرؔ کی غزلوں میں بھی ملتے ہیں سہیلؔ اور جگرؔ کے ہاں یہ رنگ پائیدار اور غیر منقطع ہے۔

سیاسی تنگ نظری اور سیاسی تیرہ دلی کے خلاف دونوں کے کلام میں احتجاج کی ایک زیریں لہر ملتی ہے جو رفتہ رفتہ جگرؔ کے یہاں زیادہ قوی اور نمایاں ہو گئی ہے۔ جگر صاحب نے مستقل نظمیں بھی کہی ہیں اور اپنے تاثرات کا اظہار بڑے درد اور دلیری سے کیا ہے۔ سب و شتم اور شور و فتن سے نہیں، بعض معصوم جس سے انقلابی شاعری مراد لیتے ہیں۔

یہاں اس امر کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ حسرتؔ اور سہیل دونوں کے سیاسی مسلک تھے۔ ان کے کلام میں اس کا اثر ملے تو تعجب کی بات نہیں، جگر صاحب کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں تھے۔ کم سے کم جہاں تک مجھے اس کا علم ہے، اس لئے جگر صاحب جب کسی "ظلم و زیادتی" پر ملول یا برہم ہو کر کچھ کہتے تو ہر طبقے کے لوگ متاثر ہوتے اس لئے کہ ان کی آواز کو کسی سیاسی یا جماعتی نعرے کی بازگشت نہیں بلکہ انسانی ضمیر کی پکار سمجھتے تھے اور جگرؔ صاحب نے یقیناً وہ درجہ حاصل کر لیا تھا جہاں ان کی آواز کو یہ حیثیت حاصل تھی!

جگر صاحب کو اعزازی ڈائرکٹریٹ تفویض کرنے کا مسئلہ مسلم یونیورسٹی کے سامنے آیا تو سب سے زیادہ جس خیال نے اس تحریک کو تقویت پہنچائی وہ یہ تھا کہ جگر صاحب اب شاعری کے دبستانوں اور حریفانہ چشمکوں سے بلند اور شخصیت کے اعتبار سے بھی "غیر متنازعہ فیہ" ہو چکے ہیں۔ ان کی شاعری پر کسی طرح کا لیبل لگا کر مخصوص و محمود نہیں کیا جا سکتا، وہ شاعری کے اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں شاعری کے ساتھ ساتھ شاعر کی اہمیت و عظمت کو بھی دیکھتے ہیں۔ یہ پیش کش جگر صاحب کو علی گڑھ کی طرف سے آنی بھی چاہیئے تھی، اس لئے کہ علی گڑھ نے ہی اردو ادب کے دبستانوں کو ختم کیا تھا اور اس کو ایک تنگنائے آب سے نکال کر "زندہ رود" کا درجہ حاصل کرنے کی صلاحیت بخشی تھی!

علی گڑھ نے اس طرح جو عزّت افزائی کی تھی اس کا جگر صاحب پر بڑا اثر تھا۔ کنووکیشن کے موقع پر آنے کے لیے بے قرار تھے۔ ہر خط میں اس کا ذکر کرتے اور ہر شخص سے کہلا بھیجتے لیکن صحت اتنی گر چکی تھی کہ معالجوں نے سفر کرنے کی اجازت نہ دی۔ جگر صاحب کو علی گڑھ سے عشق تھا۔ یہاں کی دعوت پر ضرور آتے اور جاتے تو جیسے علی گڑھ کا گوشہ گوشہ ان کی موجودگی سے مزیّن ہو جاتا!

جگر صاحب ان رسوم و قیود اور اصرار و انکار کے حدود سے آگے نکل گئے تھے جو ہمارے بعض شعراء کا وطیرہ بن گیا ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ وہ علی گڑھ بلائے جاتے تو بڑی خوشی سے چلے آتے تاوقتیکہ کوئی سخت معذوری سے سابقہ نہ ہوتا۔ جو کچھ پیش کیا جاتا خوشی سے قبول کر لیتے۔ طلبا ان کا احترام کرتے تھے اور ان کی پذیرائی کو اپنے لئے سرمایۂ افتخار جانتے، اس لئے ان سے زیادہ سے زیادہ جو بن پڑتا نذر کرتے، دوسرے شعراء کے لئے بھی علی گڑھ میں بہت کچھ ہوتا ہے لیکن جس "جذبۂ بے اختیار شوق" سے جگر صاحب کے لئے ہوتا دوسروں کے لئے نہیں!

جگر صاحب اس پر بھی اصرار نہیں کرتے تھے کہ ان کے پڑھنے کا نمبر سب سے پہلے آئے، کس کے بعد آئے یا سب کے بعد آئے۔ جب کہا گیا، جتنا کہا گیا پڑھ دیا اور اپنی جگہ پر واپس آ گئے۔ پڑھنے سے پہلے بطور تمہید یا معذرت نہ انکسار کرتے نہ افتخار، فرصت کی کمی، صحت کی خرابی، سفر کی صعوبت وغیرہ کا کبھی ذکر نہ کرتے جیسا کہ شعراء بالعموم کیا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ کسی نے نہیں سُنا کہ یہ شعر ملاحظہ فرمائیے گا یا وہ دوسرے شاعروں کے پڑھنے کے طریقے یا اس کی سج دھج یا اس کے کلام پر نکتہ چینی کا ایک لفظ نہ کہتے، خاموش بیٹھے

رہتے۔ آس پاس والوں سے گفتگو یا ہنسی مذاق نہ کرتے۔ سنجیدگی اور خلوص سے شریفانہ نرم لہجے میں داد دیتے، ہر شاعر کا اکرام ملحوظ رکھتے۔ ایک بار تو ایسا ہوا کہ ایک لڑکے نے مشاعرے میں عمداً یا غلطی سے جگر صاحب کی پرانی کوئی غزل پڑھ دی۔ جگر صاحب پاس بیٹھے تھے کسی طرح کا مطلق اثر نہیں لیا۔ لڑکے کی پیٹھ تھپتھپائی اور شفقت کا اظہار کیا۔ یہ دیکھ کر کسی اور کو بھی ہمّت نہ ہوئی کہ لڑکے سے تعرض کرتا۔ جیسا کہ بیان کر آیا ہوں علی گڑھ کے طلبا، خواہ وہ کسی مسلک و مذاق کے ہوں جگر صاحب کو بڑی عزّت و محبّت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ امتیاز بہت سے لیڈروں کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ میں نے اکثر محسوس کیا جیسے ان سے مل کر طلبا کی صحت مند صلاحیتیں بیدار ہونے لگی ہوں۔ یوں بھی علی گڑھ کے طلبا میں اچھے اثرات کے قبول کرنے کی استعداد نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ اس کا سبب وہ روایت اور وہ فضا ہے جس کے قائم کرنے میں ہماری قوم کے بہترین افراد نے اپنی بہترین صلاحیتیں مدّتوں صرف کی ہیں۔ جس طرح طلبا میں ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے اچھے اساتذہ، اچھی لائبریری، اچھا سازو سامان، اچھا کھانا پینا، رہنا سہنا، باغ، سبزہ زار، صحبت اور تفریحیں اور ورزشیں، کھیل کے میدان ڈائیننگ ہال، یونین کلب وغیرہ سود مند ثابت ہوتے ہیں اسی طرح کچھ اس طرح کا انتظام بھی ہونا چاہیئے کہ ہماری وہ گرانمایہ شخصیتیں جو علی گڑھ سے باہر ہوں خواہ وہ علم وفضل کے شعبے سے تعلّق رکھتی ہوں، مسلم یونیورسٹی کے حدود کے اندر فراغت سے مستقلاً آباد ہو جائیں اور ہمارے نوجوان طلبا کے سرچشمہ فیض ثابت ہوں۔

ذہن میں کچھ اسی طرح کی باتیں تھیں کہ چند دن ہوئے بعض احباب نے اس کی کوشش شروع کردی تھی کہ کوئی ایسا انتظام کیا جائے کہ آرام و یکسوئی کی زندگی گزارنے کے لئے جگر صاحب مستقل طور پر علی گڑھ آجائیں لیکن یہ کوشش

آگے نہ بڑھ سکی اور جگر صاحب ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے!

جلیل القدر معاصر شعراء کی طرح جگر صاحب نے مشاعرے کی منزلت کو آخر دم تک نباہا اور اس روایت کو برقرار رکھا جس کی رو سے مشاعرے کا شعار اعلیٰ تہذیبی اداروں میں ہوتا تھا۔ بعض ارباب سخن کے یہاں مشاعروں میں اسی طرح کے آداب ملحوظ رکھے جاتے تھے جو مذہبی یا نیم مذہبی محفلوں کے ہوتے۔ ہماری زبان جس رتبے کو پہنچی اور تہذیب کو جو گراں مائگی نصیب ہوئی اس میں ان مشاعروں اور ان کے آداب کو بڑا دخل ہے۔ زبان اور تہذیب اسی طرح کی آزمائش سے گزر کر اپنا مقام پیدا کرتی ہیں۔ نوجوان طلباء کا ہجوم خواہ کسی سلسلے میں اکٹھا ہو، ادنیٰ بہانے یا اشارے پر آج جس طرح بے قابو ہو جاتا ہے اور وہ سب کر گزرتا ہے جو کسی اور کے مناسب حال ہو یا نہ ہو، طلباء کے شایانِ شان ہرگز نہیں ہوتا۔ مشاعروں میں آج سے کم و بیش ۲۰، ۲۵ سال پہلے تک کم از کم علی گڑھ میں دیکھنے میں نہیں آتا۔ اس میں سامعین کا چاہے جتنا گناہ ہو، ہمارے شعراء کا بھی کچھ کم نہیں، بعض شعراء ایک ایسے مشاعرے یا موقع کے لئے جہاں نوجوان لڑکیاں اور خواتین موجود ہوتی ہیں ایسی ناپسندیدہ اور بیباک نظمیں لکھ لاتے ہیں جو نوجوانوں کے حیوانانی و شہوانی جذبات کو برانگیختہ و بے قابو کرنے میں معاون ہوتی ہیں۔ ایسے یہ شعراء اپنا بڑا کارنامہ اور انعام سمجھتے ہیں۔ دیکھا تو یہاں تک گیا ہے کہ مشاعروں میں اس نظم کو سنانے کی کوئی فرمائش نہیں کرتا تو یہ شعراء خود نہایت بے غیرتی کے ساتھ اور اتنے ہی بھونڈے پن سے اشارتاً اس کی یاد دہانی کرتے ہیں! شاید غالب کی پیروی میں جہاں انھوں نے "غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد" کہا ہے!

جگر صاحب میں بڑی حیا اور غیرت تھی۔ کہیں کسی محفل میں بیٹھے ہوں ہمیشہ نظر نیچی رکھتے تھے، جیسے اس محفل میں نوجوان خواتین اور لڑکیوں کو اپنی ذمہ داری

اور امانت سمجھتے ہوں۔ بے تکلف احباب میں بھی بیٹھ کر وہ اس طرح کے فقرے زبان پر نہیں لاتے تھے جن میں عورتوں سے بے راہ روی کے روابط کا اشارہ ملتا ہو، خواہ وہ فقرے کتنے ہی "در پردہ" کہے جا سکتے ہوں۔

ان باتوں کا خیال کرتا ہوں تو جگر صاحب اور ان کے ساتھی شعرا آج کس حیرت والم سے یاد آتے ہیں جن کو دیکھ کر اُس وقت تو اتنا نہیں جتنا اب محسوس کرتا ہوں کہ تہذیب و شرافت بھی دنیا میں کتنی بڑی نعمت، اس لئے ذمہ داری ہے۔

جگر صاحب شعر کہہ سکتے تھے، اپنے شعر پر مضمون نہیں لکھ سکتے تھے، اچھے اور بڑے شعراء بالعموم ایسا نہیں کر پاتے، بعض ایسا کر سکتے ہیں لیکن ان کا مضمون ان کے شعر سے اچھا ہوتا ہے اور کبھی کبھی بجائے ان کے دوسروں پر صادق آتا ہے، اِس لئے وہ خارج از بحث ہیں جگر صاحب سے جب بھی اس طرح کی بات آئی، بڑے شوق سے بحث میں حصّہ لینے کے لئے تیار ہوئے لیکن گفتگو کچھ اس طرح کی کرنے لگتے تھے جیسے شعر کہنے کے طور طریقوں پر بحث نہ کر رہے ہوں۔ غزل کی اہمیت سے انکار کرنے والے سے لڑائی مول لینے پر تیار ہوں۔ یہ لڑائی بھی کچھ اس طرح کی ہونے والی ہوتی جیسے اس نیک کام کے لئے حربہ کوئی نہ ہو حوصلہ بہت ہو۔ ظاہر ہے ایسے نبرد آزما کا زیادہ دیر تک مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

بایں ہمہ ایک جگہ وہ بڑی جرأت اور صفائی سے ایک ایسی بات کہہ گئے ہیں جو ہماری اُردو شاعری کے اعتبار و امتیاز کو بڑی خوبی سے واضح کرتی ہے، شعر یاد نہیں آتا مفہوم یہ ہے شعر میں "مشرقیت" نہ ہو تو وہ مغربیت کی نقالی ہے اور کچھ نہیں۔ یہ بات بظاہر مولویوں جیسے معلوم ہوتی ہے لیکن در اصل یہ ایسی

ہے نہیں، مشرقیت کیا ہے، کیا نہیں اس سے یہاں بحث نہیں، لیکن نئے انداز کے شاعروں کو اس نکتے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیئے اس لئے کہ یہ ایک ایسے شخص کا قول ہے جس کے کلام اور شخصیّت سے کافی زمانے تک ہم محفوظ و متاثر رہے ہیں اور یہ وہ زمانہ تھا جب مغربیت اور عقلیت اپنے منتہا پر تھی اور ہمارے فکر و تخیّل پر مغرب سے زیادہ مغربیت طاری تھی۔

جگرؔ صاحب نے براہِ راست شاید ہی کبھی مجھے خط لکھا ہو۔ بچّوں میں سے کسی کو لکھ دیتے، وہ مجھے بتا دیتے۔ جگرؔ صاحب کا انداز بھی ان کی دوسری اداؤں کی طرح کتنا دلکش تھا۔ وفات سے کچھ دن پہلے لڑکوں میں سے ایک کے نام خط آیا۔ قیاس کرتا ہوں کہ مضمون کیا رہا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ شانِ خط میں بھی وہ رعنائی اور صلابت نہیں رہ گئی تھی جو پہلے تھی۔ جگرؔ صاحب کا خطِ شکست نہایت پاکیزہ اور پختہ تھا۔ جس پر التفاتِ خاص ہوتی اس کو اپنی کوئی غزل ہاتھ سے لکھ کر دیتے اور مخصوص طغرا میں اپنے دستخط کر دیتے اور تاریخ لکھ دیتے۔ جگرؔ صاحب کو جس حال میں ہمیشہ سے دیکھتا آیا تھا اس کے بعد ان کی بیماری کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھنے کی ہمّت نہیں ہوتی تھی۔ جس خط کا اوپر ذکر کر آیا ہوں اس میں ایک شعر لکھا تھا جو مجھے سُنا دیا گیا۔ کہہ نہیں سکتا اوروں نے بھی کہیں سُنا یا پڑھا ہے یا نہیں شعر یہ تھا ؎

کہیں ایثارِ غم جاتا ہے ضائع
چمن شاداب ہے شبنم نہیں ہے

جگرؔ صاحب کی زندگی اس طرح کی تھی اور ایسی زندگی کم کسی کو نصیب ہوتی ہے ۞

پنڈت جواہر لال نہرو

کہاں ہے آج تو اے آفتابِ نیم شبی!
ہجومِ غم میں نہیں کوئی تیرہ بختوں کا!

پنڈت جی ہم سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گئے۔ موت آگے پیچھے سبھی کو آئے گی۔ اس سے زیادہ، عام، یقینی اور غمناک حادثہ کوئی دوسرا نہیں۔ سب سے زیادہ دردناک موت تو ذاتی طور پر اُن کی محسوس ہوتی ہے جن سے خون کا رشتہ ہو۔ اس کے بعد اُن کی جن سے خون کا نہیں احترام و عقیدت کا ہوتا ہے، جنھوں نے دوسروں کی خاطر اپنی صلاحیتیں اور اپنی قیمتی سے قیمتی متاع وقف رکھی، جن کے فیض سے انسانوں کی چھوٹی بڑی جماعتوں میں یگانگت آئی، ایک دوسرے کے رنج و راحت اور نفع و نقصان میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جہالت، بھوک، بیماری، ذلت اور تنگ نظری سے چھٹکارا ہوا۔ ان کے بجائے فخر، فراغت اور مسرت سے ہمکنار ہوئے، علم اور سچائی کے پھیلانے، دوسروں کی خدمت کرنے اور ظلم و زیادتی سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔

پنڈت جی سے ہمارا یہی رشتہ تھا، کتنا پرانا اور کبھی نہ مٹنے والا رشتہ، ایک مدت تک ان کو اُن کے کاموں کو دیکھنے، ان کی باتیں سُننے اور اُن اقدار و روایات کا لحاظ کرنے سے جو ان کی ذات سے منسوب تھیں، اگر ہم اُن سے خون کا سا رشتہ بھی محسوس کرنے لگے ہوں تو کیا عجب۔ اُن کی وفات پر درد و الم کا جو عالم دیکھا گیا اُس سے تو کچھ ایسا ہی ثابت ہوتا ہے۔ ہر شخص اُن کو فرداً فرداً بالکل اپنی طور پر عزیز رکھتا تھا۔ بڑے پیمانے پر یہ امتیاز بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے!

مہاتما جی اور پنڈت نہرو نے ہماری قومی اور اخلاقی زندگی کی تخلیق و تشکیل کی اور اس کو ایک ضمیر دیا۔ اتنے بڑے ملک کو جو اپنے اور دوسروں کے لائے ہوئے بے شمار دُکھ اور درماندگی میں مدت الایام سے مبتلا رہا یا رکھا گیا ہو، اُس کو کم سے کم مدت میں عزت و اقتدار کے درجے پر پہنچا دینا انھیں دونوں برگزیدہ شخصیتوں کا کام تھا۔ آج جبکہ دونوں نہیں ہیں ہم کو واضح طور پر اس کا احساس ہو رہا ہے کہ ذمہ داری کے کام جو اُنھوں نے ہمارے لئے چھوڑے، ان کے بجا لانے میں ہم سے کیسی صریح غفلت ہوئی ہے۔

ہندوستان کے علاوہ شاید ہی کسی اور ملک کو یکے بعد دیگرے اس قد و قامت کے دو بڑے راہنما ملے ہوں جیسے کہ یہ دونوں تھے۔ اتنے بڑے اور زار و زبوں ملک کی بڑی خوش نصیبی تھی کہ ایسا ہوا لیکن یہ خوش نصیبی اسی وقت مفید اور مبارک ہوگی جب اس کو سچائی اور سرفروشی سے مستحکم کیا جائے اور آگے بڑھایا جائے ورنہ اس خوش نصیبی میں خطرات بھی مضمر ہیں۔

پنڈت جی گزشتہ نصف صدی تک ہماری زندگی کے ایسے معرکوں سے اس بے جگری، خلوص اور کامیابی سے گزرے کہ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہر چیز

دفعتہً وقوع میں آسکتی ہے سوا پنڈت جی کی وفات کے۔ اعلیٰ شخصیتوں کی اعلیٰ خدمات کی ذہنوں پر ایسی گرفت ہوتی ہے۔ کہ ہم ان کے ہوتے کبھی کبھی فطرت کے اٹل قوانین کو بھی بھولنے لگتے ہیں۔ اچھے آدمیوں کے بارے میں ہم غیر شعوری طور پر خیال قائم کر لیتے ہیں کہ شاید وہ ہمیشہ زندہ رہیں یا جلد نہیں مریں گے۔ اس کے برعکس بُرے اشخاص کے بارے میں یہ خیال آتا رہتا ہے کہ ان سے جلد نجات مل جائے گی۔ نیکی اور بدی کا تصرّف ذہنوں پر بالعموم ایسا ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کرشمہ ہے ہماری اس خواہش کا کہ ایسا ہو یا ایسا نہ ہو۔ لیکن اس رمز کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ایسی خواہش پیدا ہی کیوں ہوتی ہے۔ خواہش یا ارادہ نیک اور بلند ہے تو اس کا سرچشمہ کوئی حقیقت اعلیٰ ہوگی۔

ریڈیو سے لمحے لمحے کی خبریں آتی رہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم دنیا کے کسی اور خطے میں بیٹھے ہوئے ہندوستان کو ایک بھیانک بھونچال کی زد میں دیکھ رہے ہوں۔ ایک طرف یہ تھا دوسری سمت ذہن میں پنڈت جی کے اوراقِ زندگی، کتنے بے شمار اوراق، تیزی و ترتیب سے کھلتے جا رہے تھے۔ انسانی تصوّر و تخیّل بھی کیا ہوتا ہے، کوئی غیر معمولی بات پیش آجائے تو ماضی کے واقعات خواہ وہ کتنے ہی دُور یا پاس کے زمانے میں کیوں نہ گزرے ہوں حال کے آئینے پر ایک مخصوص معنویت کے ساتھ منعکس ہونے لگتے ہیں۔ ایسا تو نہیں کہ ماضی، ماضی مطلق، بن کر نہ رہ جاتا ہو بلکہ بشکل دیگر حال میں دخل دینے اور اس پر اثر انداز ہونے کے لئے برابر ہمارے تعاقب میں رہتا ہو؟ ماضی اور حال کے تانے بانے میں انسانی تاثر اور تخیّل جس طرح اور جس قسم کے گل بوٹے

بناتے ہیں وہ ایک پُر اسرار و فکر انگیز کرشمہ ہے جس کا تصوّر عالم اور عامی دونوں بقدرِ استعداد یکساں طور پر کر سکتے ہیں۔ یہ اس کرشمے کی مزید طرفگی ہے۔

اس وقت پنڈت جی کی زندگی کا ایک خاص واقعہ یاد آرہا ہے جس کو اُنھوں نے بڑے مؤثر اور سحر کارانہ انداز سے بیان کیا ہے۔ الفاظ یاد نہیں ہیں، سماں کا تصوّر و تصویر گڈمڈ ہو کر سامنے آرہی ہے اور وہ مصرع یاد آرہا ہے جو ہمارے ایک مشہور شاعر نے "افسانۂ ہستی" سُن کر کہا ہے یعنی ع

"کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرزِ بیاں ہے"

اسیری کا زمانہ تھا۔ عالی خاندان، خوبصورت، نوجوان، نیک نہاد چہیتی بیوی لاعلاج مرض میں مبتلا، بھوالی کی صحت گاہ میں مقیم ہے۔ اس کو دیکھنے کے لئے اجازت مل گئی ہے۔ بھوالی کے سفر میں ہیں۔ مریضہ کی بیماری اور بے چارگی کا احساس بے قرار کئے ہوئے ہے۔ ملک اور قوم کو ہر طرح کی زبوں حالی سے نجات دینے کا چیلنج قبول کر چکے ہیں۔ پہاڑ کی بلندی، اس کا سکوت وثبات، نشیب و فراز، کتنی بلندی کیسی پستی، درخت جھاڑیاں، راستے، ان سب کا دم بہ دم ٹھنڈی نم آلود کبھی دبیز کبھی ہلکی گھر کی چادر میں دیکھتے دیکھتے ملفوف اور پھر یک بہ یک نمودار ہو جانا، دل میں طرح طرح کے جذبات و خیالات کا ہجوم، ان کا عمل اور ردِ عمل، حال کو مستقبل کے لئے بہتر بنانے کی فکر، ذاتی امیال و عواطف کی کشاکش، قومی ذمہ داری، اخلاقی تقاضے، غرض ذہن میں تضاد و توافق کا ایک جہان لئے ہوئے سرگرمِ سفر ہیں!

یہ تصویر ذہن میں آئی۔ پھر پنڈت جی کی زندگی کے وہ لیل و نہار آئے جب اُنھوں نے ہندوستان کے ماضی کو ایک معنی، اس کے حال کو سمت و رفتار دینے اور مستقبل کو مضبوط و مبارک بنانے میں اپنی بہتر سے بہتر استعداد اور وسائل

سے دریغ نہ کیا۔ نہ کبھی دیکھا، نہ سوچا کہ عمر گریزاں کے کیسے کیسے قیمتی لمحے جسم وجان کے کتنے خوشگوار تقاضوں سے مستغنی یا محروم گزرتے چلے جا رہے ہیں جو پھر لوٹ کر نہ آئیں گے ....

دفعتاً ریڈیو سے ایک دردناک لے بلند ہوئی۔ تصوّرات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ یاد آیا کہ ہم کسی سانحے سے دوچار ہیں۔ پنڈت جی اس جہاں سے رخصت ہو چکے ہیں۔ عزیزوں دوستوں، عقیدت مندوں اور ساتھیوں کی بے قراری بے بسی اور مایوسی ذہن کے افق پر چھانے لگی۔ ریڈیو کی کمنٹری میں گزرے ہوئے حالات و حوادث کا جائزہ لیتا رہا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ ایسے مواقع پر ذہن بالعموم اسی طرح پر کام کرتا ہے۔ صرف کینوس کی وسعت اور نقوش کی بوقلمونی اور گراں مائگی کا فرق ہوتا ہے۔ یہ تو نہیں کہتا کہ پنڈت جی کی زندگی کا اس طور پر نظارہ یا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایسی زندگی کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی ہوگی۔ لیکن اس میں شک نہیں ایسے سرآمد روزگار قوم اور ملک کو بڑے انتظار اور آزمائش کے بعد نصیب ہوتے ہیں!

پنڈت جی خاندان، مزاج، تعلیم و تربیت، رہن سہن، پسند ناپسند ہر اعتبار سے ارسٹوکریٹ (ARISTOCRAT) تھے۔ ان میں ارسٹوکریٹ کی خوبیاں اور خامیاں دونوں تھیں۔ خامیاں کم خوبیاں زیادہ۔ تمام عمر عوام سے وابستگی پھر مہاتما گاندھی کا تصرّف (اور یہ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں) ایسے عوامل تھے جن سے پنڈت جی کے طور طریق میں بڑی تبدیلی آگئی تھی لیکن اکثر اس کا بھی احساس ہوا کہ پنڈت جی کا قلب مہاتما گاندھی کے ساتھ لیکن فکر و ذہن کے اعتبار سے وہ خود مختار تھے!

ارسٹوکریٹ ہونے کی ایک سب سے بڑی خوبی جو اُن میں عمر کے آخر تک

تازہ اور بیدار رہی یہ بھی کہ وہ کسی حال میں دوسرے اور تیسرے درجے کے لوگوں سے مفاہمت نہیں کر سکتے تھے۔ سستی شہرت حاصل کرنے پر وہ کبھی آمادہ نہ ہوئے جس کی وجہ سے ان کی شہرت اکثر معرضِ خطر میں رہی اور دوسرے نام نہاد لیڈروں کا نام نمود اور نان نفقہ بڑھتا رہا۔ پنڈت جی نے جو روایت قائم کردی تھی، اس کو قائم رکھنا اور آگے بڑھانا بڑا مشکل تھا، اس لئے اس پر مسلسل قیاس آرائی ہو رہی تھی کہ پنڈت جی کے بعد اس صلیب کو کون اُٹھائے گا! چنانچہ رحلت کے بعد یہ نزاکت بعض نامسعود امکانات کے ساتھ سامنے آئی۔ یہ ہم سب کی خوش نصیبی ہے کہ پنڈت جی کی آزمودہ اقدارِ اعلیٰ کی رہنمائی میں ہم اس اس مشکل مقام سے آسان گزر گئے گو بعض مبصروں کی یہ رائے بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ پنڈت جی کے جانشین کا مسئلہ اتنا مشکل نہیں ہے جتنا پنڈت جی کے جانشین کے جانشین کا۔

مسائل پر پنڈت جی کی نظر سائنٹفک بھی ہوتی اور اخلاقی بھی۔ وہ کسی مذہب کے پیرو نہ تھے لیکن سائنس، تاریخ، ٹکنالوجی کسی کو اخلاقی، سماجی، بالفاظِ دیگر انسانیت کے تقاضوں سے علیحدہ نہیں سمجھتے تھے۔ تہذیب کی ناکامی اور ٹکنالوجی کی کامیابی کے اس دَور میں حب انسانی و ماغ حالات و واقعات سے اتنا واقف اور اصول و حقائق سے اس درجہ ناآشنا ہے، پنڈت جی کا رویّہ نہایت درجہ صحت مند و اُمید افزا تھا۔ پنڈت جی نے آج سے بہت پہلے اپنے بارے میں یہ لکھا کہ ہندوستان کے مستقبل پر ان کا اثر اچھا بھی ہو سکتا تھا اور خراب بھی، کتنی صحیح بات کتنے پہلے کہہ دی تھی۔ ایک ارسٹو کریٹ کا اندازِ فکر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کے آٹو کریٹ یا ڈکٹیٹر ہو جانے کا ہمہ وقت امکان رہتا ہے لیکن قدرتِ کاملہ کا یہ احسان ہے کہ اس ہندوستان اور پنڈت جی دونوں کو مہاتما گاندھی نے

کے فیضان اثر میں دے دیا۔ سوچنے کی بات ہے کہ پنڈت جی مہاتما گاندھی کے روحانی و اخلاقی تصرّف سے بیگانہ رہتے تو کیا ہوتے یا کیا ہوتا؟ پنڈت جی کو کتنے، کیسے اور کہاں کہاں کے تقاضے کبھی علیحدہ علیحدہ، کبھی ایک ساتھ اپنی طرف کھینچتے، کبھی ان سے ٹکراتے، لیکن خدا جانے ان میں کتنے طاقتور اسپرنگ لگے ہوئے تھے یا کس چٹان میں ان کے پاؤں گڑے ہوئے تھے کہ حتی الوسع وہ کبھی راہ سے بے راہ نہ ہوئے۔

گاندھی جی نے آزادی، عدم تشدّد سے حاصل کی تھی لیکن تشدّد ہی کا شکار ہوئے۔ قوم اور ملک کی امانت پنڈت جی کے سپرد ہوئی۔ اُن کو جس زمانہ، جن حالات اور جن لوگوں سے سابقہ ہوا وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ بین الاقوامی سیاست کے پیچ و خم سے قطع نظر جہاں شیطنت، ہوس یا حماقت کی ایک چنگاری سے سارا جہاں خاکستر ہو جاتا۔ خود ہندوستان کی آزادی مختلف متضاد عناصر و عوامل کی زد میں تھی۔ آج بھی ہے۔ یہ پنڈت جی کے بین الاقوامی وقار و اعتبار کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان نہ صرف ہر گزند سے محفوظ رہا بلکہ اقوامِ عالم کی صف میں اس کو ممتاز جگہ ملی۔ ظاہر ہے جو شخص زندگی میں اتنا محترم و معتبر مرنے کے بعد کتنا محترم و معتبر ہو گیا ہوگا۔

پنڈت جی عالمی نقطۂ نظر سے سوچنے کے عادی تھے۔ ان کی نظر مختلف و متفرق حالات و سانحات پر اتنی نہیں رہتی جتنی اقوامِ عالم کی تقدیر پر۔ وہ سطح سمندر کی لہروں کو اتنی اہمیت نہیں دیتے تھے جتنا سمندر کی اُن داخلی قوتوں اور بیرونی عوامل کو جو اسے جنبش میں لاتے تھے۔ وہ ادنیٰ آدمیوں اور اُن کی ریشہ دوانیوں کو ناقابلِ التفات سمجھتے تھے۔ اس سے جہاں فائدہ ہوتا وہاں نقصان بھی پہنچ جاتا۔ پنڈت جی کو ایسے المیوں سے اکثر سابقہ رہا۔ پنڈت جی کی لیڈر شپ بدرجہا زیادہ کامیاب ہوتی اگر ہندوستان بحیثیت مجموعی اس سے زیادہ ترقی یافتہ

ہوتا جتنا کہ ان کو ملا تھا۔

پنڈت جی نے اپنی صاحبزادی کو بڑی شفقت سے خطوط کی شکل میں تاریخِ عالم کی دھوپ چھاؤں سے روشناس کرایا ہے۔ یہ تاریخ ان کی علیحدہ ایک مستقل تصنیف بھی ہے۔ پنڈت جی کے نزدیک تاریخ ایک انجیل کی حیثیت رکھتی ہے جس میں اُمتوں کے لئے کھلی اور چھپی بے شمار نصیحتیں اور عبرتیں ملتی ہیں۔ ان کی ادبی و علمی تحریروں میں بڑے ذہن کی کیسی اور کتنی حسین و عظیم تخلیقی صلاحیتیں نظر آتی ہیں۔ ان تحریروں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ قلم سے کیا کیا اور کیسے کیسے کام لئے جا سکتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ کے بھی اور فنونِ سپہ گری کے بھی۔

میں تاریخ کا طالبِ علم کبھی نہیں رہا لیکن تاریخ کی بعض کتابیں پڑھی ہیں۔ پنڈت جی کی لکھی ہوئی تاریخ بھی۔ پنڈت جی نے تاریخِ عالم کا مطالعہ بڑی بلندی سے کیا ہے۔ ایسی بلندی سے جہاں سے حشرات الارض، چھوٹے بڑے حیوانات، عمارتیں، متفرق مناظر اور اسی طرح کے حالات و حوادث پر حکم لگانے میں تعصب یا تنگ نظری کا لوث تک نہیں آنے پاتا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ ع

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے!

تاریخ مطالعہ کی کوئی شاخ ہو اس کا سمجھنا اور صحیح نتیجے پر پہنچنا آسان نہیں ہے، اس لئے اور کہ صحیح تاریخ کا لکھنا سب سے زیادہ مشکل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تاریخ لکھنے کے لئے ضروری ہے کہ حالات و واقعات کا دور سے اور دیر سے مشاہدہ و مطالعہ کیا جائے تاکہ ذہن اُن حالات و حادثات سے متاثر نہ ہو جو وقتی اور ہنگامی ہوں۔ لیکن صحیح واقعہ تو وہی ہے جو ایک خاص وقت میں خاص مقام پر، خاص حالات میں پیش آیا۔ بہت دور بہت دیر یا بہت اونچائی سے دیکھنے

میں تو حالات و واقعات اشخاص اور جائے وقوع سب نظر سے اوجھل ہو جائیں گے۔
یہی سبب ہے کہ تاریخ کے صحیح مطالعہ کے لئے تاریخ کے ابتدائی دور سے ابتدائی ماخذ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جہاں واقعات کی خبر ملتی ہے نہ کہ مورخین کرام کی فکر و نظر۔ کسی مشہور مصوّر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک تصویر بنانے سے قبل اس نے دعوتِ عام دی کہ جس کی تصویر بنانی ہے اسے آج سب لوگ اچھی طرح دیکھ لیں ورنہ کل سے وہی دیکھیں گے جو میں بنا دوں گا۔ ہر زمانے میں حاکموں نے مورخوں سے اسی طرح کا کام لیا ہے اور ان دونوں بزرگوں نے شاید ہی کسی علم سے اتنی بے تکلفی برتی ہو جتنی تاریخ سے۔
پنڈت جی کی تاریخی تصانیف میں تحقیق یا تنقید کی اتنی کارفرمائی نہ ملے گی جتنی تاثرات کی۔ یہی رنگ ان کی دوسری تحریروں میں بھی کم و بیش ملتا ہے۔ علمائے فن تاثراتی اندازِ تحریر کو کتنا ہی ناقابلِ التفات قرار دیں اس اعتبار سے اس کا قصور ضرور معاف کیا جاسکتا ہے کہ اس میں جھوٹ کو سچ کر دکھانے کی گنجائش کم نکلتی ہے۔ پنڈت جی نری واقعہ نویسی کو اتنی اہمیت نہیں دیتے جتنی اس مخفی ناقابلِ فہم و ناپید اکنار نظامِ کائنات کو جس کے عوامل کی باہمی کشش و گریز یا عمل و ردِ عمل سے وہ واقعہ شہاب ثاقب کی مانند ٹوٹ کر ہماری دنیا اور ہماری زندگی میں در آیا ہے۔
پنڈت جی کے سوچنے اور لکھنے میں ماورائیت یا غیر ارضیت کا یہ انداز ایک ایسے اخلاقی رجحان یا ذہنی افتاد کی نشان دہی کرتا ہے جس کو معلوم نہیں کیوں وہ اپنانے سے اجتناب کرتے ہیں۔ آرٹسٹ ہو، ادیب ہو یا مفکر و صوفی (پنڈت جی کی تحریروں میں ان سب کی جھلک جابجا ملتی ہے) اپنے سے الگ اور بلند ہو کر زندگی کی حقیقت و مجاز پر نظر ڈالے گا تو اس کا تاثر یا تجربہ ویسا ہی ہوگا۔ جیسا کہ پنڈت جی کے فکر و فن میں ملتا ہے۔

پنڈت جی سے کبھی شرفِ نیاز حاصل نہیں ہوا۔ صرف دو بار مسلم یونیورسٹی میں اور ایک دفعہ دوسرے مقام پر دُور سے دیکھنے اور تقریر سُننے کا اتفاق ہوا۔ عوام کے دلوں میں ان کی اور عوام کی پنڈت جی کے دل میں جو بے پایاں محبت و منزلت تھی اس کا مظاہرہ ایک بار آنکھوں سے دیکھا اور ایک جگہ اس کا ذکر پنڈت جی کی تحریر میں نظر سے گزرا۔

جنرل الیکشن کی سرگرمیوں کے سلسلے میں ایک جگہ اپنی بے پایاں تگ و دو کا ذکر بڑے مؤثر انداز میں کیا ہے۔ کانگرس کے اغراض و مقاصد سے عوام کو روشناس کرانے اور کانگرس کے اُمیدواروں کو کامیاب بنانے کی مہم پر روانہ ہوئے ہیں۔ دو عدد مائکروفون ہیں اور کچھ ساتھی، دور دراز، اجنبی و شوار گزار راستوں پر چلے جا رہے ہیں۔" وہ حضرِ بے برگ و سامان وہ سفرِ بے سنگ و میل" کا نقشہ ہے، سواری کے لئے کہیں موٹر، کبھی گھوڑا، اکثر پیدل، تھوڑی تھوڑی دور پر گاؤں والوں کا اجتماع، آس پاس کی آبادی کے اعتبار سے کم یا زیادہ۔ صبح سے رات گئے تک موسم کی سختیاں جھیلنا، نفس کے عام مطالبات سے بے پروا، بغیر کسی اکتاہٹ کے اشتیاق و انتظار میں بیٹھا ہوا، ہر جگہ ٹھہرنا، تقریر کرنا، غریب کسان اور مزدوروں میں اپنی محبّت بانٹنا، ان کی دعائیں لینا اور آگے روانہ ہو جانا۔

اس ذکر کو آخر میں کچھ اس طرح کے الفاظ پر ختم کیا ہے۔ کھانے پینے آرام کرنے کی جگہ نہ موقع نہ فرصت۔ جتنی دیر گاڑی میں بیٹھنے کو مل گیا نیند سے بے اختیار ہو کر غافل ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں پھر وہی استقبال، نعرے، دعا سلام اور روانگی۔ مقررہ پروگرام کی پابندی کا یہ حال تھا کہ ایک جگہ سات بجے شام کو تقریر کرنی تھی، پہنچا تو صبح صادق نمودار ہو رہی تھی!

دوسرا واقعہ جو سامنے گزرا یہ ہے۔ آزادی ملنے سے کچھ دن پہلے کی بات

ہے، رات کے دس بجے سے صبح پانچ بجے تک کا سفر تھا۔ پنڈت جی بھی اسی ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔ گاڑی ایسی تھی جو بہت کم سٹیشنوں پر رُکتی تھی، شروع سے آخر تک راستہ بھر ریلوے کے دونوں سمت عوام کا ہجوم پنڈت جی کے خیر مقدم میں نعرہ لگاتا رہا، قطعاً اس سے بے خبر رہ کر پنڈت جی کے دیدار کا کوئی امکان تھا بھی یا نہیں، یا پنڈت جی کے کانوں تک خیر مقدم کے نعروں کی آواز پہنچی بھی تھی یا نہیں! صرف اتنا پتہ لگ گیا تھا کہ پنڈت جی گاڑی میں موجود تھے۔ گاڑی کے ٹھہرنے یا اُس کے سُست رفتار ہو جانے کا بھی کوئی سوال نہ تھا۔

دور اور نزدیک کے تقریباً تمام مرد عورت، بچے جوان بوڑھے کھنچ کر چلے آتے تھے۔ نعرے اس زور سے بلند ہوتے کہ گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ ماند پڑ جاتی تھی۔ "تا نہ پنداری کہ تنہا میروی" کا نظارہ کس نے دیکھا ہوگا، کتنے لاکھ آدمی رہے ہوں گے جو کم و بیش ڈیڑھ سو میل تک پنڈت جی کے خیر مقدم میں نعرے لگانے اور اپنی خوشی اور فخر کا اظہار و اعلان کرنے کے لئے بغیر کسی لالچ یا دباؤ کے سنسان جنگل بیابان میں تمام رات کھڑے رہے ہوں گے جیسے اپنے ہیرو کو کاندھوں پر اُٹھائے ہوئے لا رہے ہوں!

ریڈیو پر سُنایا جا رہا ہے، پنڈت جی کی ارتھی اُٹھائی گئی۔ مجمع فرطِ غم سے بے قابو اور بے قرار ہے۔ ارتھی کا سفینہ جنتا کے اُمنڈتے ہوئے سمندر میں ہچکولے کھاتا چلا جا رہا ہے۔ بے اختیار پنڈت جی کے رات دن کے وہ سفر یاد آ گئے جس کا ذکر کر آیا ہوں۔ آج وہ کس سفر پر کہاں جا رہے تھے!

پنڈت جی کی خاکستر (استھی) اسپیشل ٹرین سے دہلی سے الہ آباد لائی گئی جہاں اُسے گنگا جمنا اور سرسوتی کی ٹھنڈی شفاف مقدس آغوش میں دے دیا گیا۔

جس طرح آج سے کم و بیش ۹۴ سال پہلے اسی الہ آباد میں انہی دریاؤں کی فضا اور روایات میں خدا نے ان کو آغوشِ مادر میں دے دیا تھا۔ یہاں سے ان آبِ رواں فیض و فروغ کے ساتھ پنڈت جی کا آخری مادی وجود اس عالمِ لازمان و لامکان کے سفر پر روانہ ہو گیا جس کی "نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!"

پنڈت جی نے ماں کی گود سے گنگا کی گود تک پہنچتے پہنچتے کیا کر دکھایا۔ اس کا ذکر تو ان کی وفات کے دن سے اب تک ہر چھوٹا بڑا، عالم جاہل، مرد عورت، اپنے اپنے طور پر، اپنی اپنی جگہ مسلسل کرتے رہے ہیں اور ایک نامعلوم مدت تک کرتے رہیں گے۔ اس وقت ایک قطعہ یا رُباعی یا دونوں یاد آ رہی ہیں جو معلوم نہیں کب کیسے کسی سے سُن کر یا کسی کتاب میں لکھا دیکھ کر ذہن میں محفوظ رہ گئی۔ بہت دنوں تک اس کی طرف توجہ نہ ہوئی، کبھی خیال گیا بھی تو یہ کہہ کر ٹال دیا۔ شعر ہی تو ہے جیسے شاعر کہتے رہتے ہیں۔ ان کو ان کے سوا اور کرنے ہی کو کیا رہتا ہے۔ پنڈت جی کی وفات پر خلق اللہ کی بے قراری و بے بسی دیکھی، اس کا جو حال سُنا اور پڑھا تو یہ اشعار یاد آ گئے۔ پھر کچھ اس طرح کا احساس ہوا کہ شاعر بھی کیا چیز ہوتا ہے، بظاہر بیٹھا باتیں بناتا رہتا ہے لیکن جب کوئی معرکہ آن پڑتا ہے، حادثہ گذر جاتا ہے تو اس کے شعر کا سہارا لئے بغیر کام نہیں بنتا۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوا کہ وحی و الہام بھی شاید اس درجے نہ متاثر ہوتے اگر پیغمبروں نے اپنے عمل میں اور شاعروں نے اپنے کلام میں ان کی تعبیر نہ کی ہوتی۔ اشعار یہ ہیں ؎

یاد داری کہ وقت زادن تو ۔۔۔ ہمہ خنداں بدنداں و تو گریاں

ہم چناں زی کہ وقت مردن تو ۔۔۔ ہمہ گریاں شوند و تو خنداں

پنڈت جی نے ان اشعار کو سچ کر دکھایا۔

دہلی سے الہ آباد یہ اسپیشل ٹرین ماتموں کے جس بے اماں و بیکراں انبوہ سے گزری اور تمام رات گزار کر صبح دس بجے تک کم و بیش چار سو میل تک ٹرین کے ساتھ چلا

وہ اُٹھا شورِ ماتم آخری دیدارِ میت پر

کا جو منظر دیکھا گیا تاریخِ عالم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ کسی کی جدائی کو بے ساختہ اس پیمانے پر کرب والم سے محسوس کرنا کہ اس کی مثال تاریخِ عالم میں نہ ملتی ہو پنڈت جی کی بڑائی کی کتنی محکم دلیل ہے۔ اُنھوں نے خدمتِ وطن میں کیسے کیسے سفر کیے، کیسی مصیبتیں جھیلیں اور اب مراجعتِ وطن کس شان سے کر رہے ہیں۔ سوچیے تو فخر کرنے اور انسان بننے کے اس میں کتنے اشارے ملتے ہیں۔"

جس شخص نے اپنی قوم، اپنے ملک اور اپنے نصب العین کی خاطر ہر رنج و راحت، خوف و خطر، نفع و نقصان اور رنگ و نام سے منہ موڑ کر ہر طرح کی سختی فرض و فخر سمجھ کر ہنسی خوشی جھیلی ہو اور عہد کی سب سے عظیم اور برگزیدہ شخصیت مہاتما گاندھی کی رہنمائی و رفاقت میں اس طرح کام کیا ہو کہ آج ہندِ جدید کی تشکیل و تعمیر میں دونوں کا نام ایک ساتھ یکساں احترام سے لیا جاتا ہو، اس کی منزلت متعین کرنے میں مبالغے سے بھی کام لیا جائے جب بھی بیان کرنے کا حق ادا نہ ہوگا!

ہندوستان کو آزاد کرانے اور ترقی یافتہ اقوام اور ممالک کی صف میں ممتاز جگہ دلانے میں دو بظاہر مختلف لیکن دراصل ایک دوسرے سے تائید و تقویت حاصل کرنے والے عوامل ہیں۔ ایک گاندھی جی کی عظیم شخصیت جو قدیم ہندوستان کی اعلیٰ روایات و اقدار کی امین و علمبردار تھی، دوسرا پنڈت جی کے عہد

(سائنسی، صنعتی، مشینی) کے ٹکنک اور تقاضوں سے آگہی اور اس پر یقین وعمل۔ جس ملک کو ان دو عوامل کی متفقہ کارفرمائی سے آزادی و سربلندی نصیب ہوئی ہو، ظاہر ہے اس کی آئندہ ترقی و تنزل کا مدار اس پر ہو گا کہ اس کے سربراہوں نے ان پر کہاں تک ایمانداری اور بے خوفی سے عمل کیا۔ کسی اور ملک و قوم کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ ہندوستان کی تاریخ و تقدیر کے پیشِ نظر یہ حقیقت بے اختیار سامنے آتی ہے کہ جب تک یہ دونوں قوتیں (گاندھی + نہرو) ساتھ ساتھ کام نہ کریں گی ملک کو وہ فروغ نصیب نہ ہو گا جس کے ہم خواہاں ہیں۔

میں سیاسیات و سماجیات کے پیچ و خم سے واقف نہیں ہوں، لیکن ایک عامی کی حیثیت سے، غلط یا صحیح یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ ملک کا انتظام ہاتھ میں لیتے ہی کانگریس حکومت کا رُخ یک طرفہ ہو گیا۔ اقتصادی، سائنسی اور مشینی ترقی کے شاندار منصوبوں نے ہم کو اس درجہ اپنی طرف مائل کر لیا کہ ہم گاندھی جی کے بتائے ہوئے راستے کو رفتہ رفتہ نظر انداز کر گئے۔ اس کی وجہ سے بعض قباحتیں راہ پا گئیں جو پنڈت جی کی زبردست شخصیت کی وجہ سے سر نہ اُٹھا سکیں۔ ہماری دعا ہے کہ وہ کبھی سر نہ اُٹھا سکیں۔ پھر بھی ضرورت اس کی ہے کہ حکومت کے آئندہ پروگرام میں پنڈت جی کے مشینی و سائنسی (ماڈرن) جوشِ عمل کے ساتھ مہاتما گاندھی کے خانہ ساز تجربات (انصاف پرستی، انصاف دوستی اور امن و آشتی) کو پیشِ نظر رکھا جائے اس لئے کہ:

پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شراب خانہ ساز
دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش!

اور "شراب خانہ ساز" وہ ہے جس کی کشید اپنے کیف و سرمستی سے کی گئی ہو اور جس میں اپنا ہی "آب و رنگ تشنہ لبی" جھلکتا ہو نہ کہ دوسروں کا!

پنڈت جی اتنے دلوں تک ہم میں گھلے ملے اور ہمارے دکھ درد میں شریک رہے اور تمام عمر ہر موقع پر ہر چھوٹے بڑے سے اس محبت و عزت سے پیش آئے کہ ہم کو یہاں تک اس کا یقین ہو گیا تھا کہ پنڈت جی زندہ ہیں تو ہم پر آنچ نہ آنے دیں گے خواہ وہ ہندوستان کے وزیرِ اعظم رہیں بھی یا نہیں! سماج دشمن عناصر سے قطع نظر (جو کتنے ہی طاقتور کیوں نہ ہو جائیں کبھی احترام کی نظر سے نہ دیکھے جائیں گے) ہر شخص خواہ وہ کہیں رہتا بستا اور پنڈت جی سے کچھ بھی واقف ہو، اس امر کا قائل تھا کہ موصوف کی شخصی حیثیت ان کی منصبی حیثیت سے کہیں زیادہ بلند و محترم تھی۔ میرا تو خیال ہے کہ کسی لیڈر میں جب تک یہ صفت نہ ملے اس کو قوم کا سردار نہ تسلیم کرنا چاہئے۔ حکمرانی وہ نہیں جو پولیس، فوج، اسلحہ اور بین الاقوامی دھڑے بندی کے زور پر کی جائے۔ حکمرانی یہ ہے کہ فردِ واحد (مردِ قلندر) بے منت غیرے اپنی ذاتی خدمات اور خوبیوں کے طفیل بے شمار لوگوں (جن میں اپنے اور پرائے دونوں شامل ہوں) کے دلوں پر قابض و متصرف ہو، جیسے پنڈت جی تھے۔

شریف اور ستم زدہ کا بڑا سہارا تھے۔ اُس زمانے کے تھے جب ایسا ہونا والا نسبی کا اولین تقاضا اور سب سے معتبر نشانی تھی۔ سب سے مشکل کام یہ ہے کہ بڑا ہو جانے پر کوئی شخص اپنے بد قسمت کم حیثیت یا کس مپرس پرانے ساتھیوں کا خیال رکھے۔ پنڈت جی کس خوشی سے بعجلتِ تمام کتنے رنجور شریفوں اور تنگ حال ساتھیوں کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے جیسے کوئی جہاز سمندر میں دفعتہً کسی مصیبت میں پھنس جاتا ہے تو مدد کے لئے اِدھر اُدھر (S.O.S) بھیجنے لگتا ہے۔ اس وقت جتنے پانی یا ہوا کے جہاز جہاں ہوتے ہیں سب کام چھوڑ کر بسرعت تمام ہر طرح کا سامان لے کر اس کی مدد کو پہنچ جاتے ہیں یہی حال

پنڈت جی کے غالباً ذاتی دفتر انتشار کا تھا جو درخواست پاتے ہی جیسے خود بخود کام کرنے لگتا ہو۔ وہ اپنے تنگ حال پُرانے ساتھیوں سے اس طرح ملتے جیسے تھوڑی دیر کے لئے اس عہد میں پہنچ گئے ہوں جب دونوں اپنے اپنے مستقبل سے بے خبر یا بے نیاز ایک دوسرے کی رفاقت میں خوشی اور بے فکری کی زندگی بسر کرتے تھے۔

حصولِ آزادی کے بعد پنڈت جی کے عہدِ حکومت میں ۱۷ سال ہندوستان کو ہر جہت سے جلد سے جلد خوش حال مضبوط و معتبر بنانے کے لئے جو منصوبے بنائے گئے اور ان کو کامیاب بنانے کے لئے جو تدابیر عمل میں لائی گئیں، وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئیں باوجود ناگزیر دشواریوں اور شاید ناگزیر ہی بدعنوانیوں کے اگر کانگرس اتنے دنوں تک پنڈت جی کی مسلسل قیادت میں برسرِ کار نہ رہتی تو ہندوستان کو وہ بلند درجہ نصیب نہ ہوتا جس پر آج ہم اس کو فائز دیکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جلد ہی دور و نزدیک کی تمام حکومتوں کو ہندوستان کی بے پایاں مستور طاقتوں، ان کے تعمیری عزائم، اس کے سیاسی مسلک (سیکولر جمہوریہ) اور ان سب کی روح رواں پنڈت جی کی عظیم شخصیت کا احساس ہوا اور اُنھوں نے ہندوستان کو دوست بنانے اور رکھنے کو اپنی اپنی حکومتوں کا اہم مقصد قرار دیا۔ حصولِ آزادی کے بعد ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں پنڈت جی کا نام جتنے لوگ جس احترام سے لیتے تھے، شاید کسی دوسری سیاسی شخصیت کا نہ لیتے ہوں۔ یہ امتیاز پنڈت جی کے منصب کے طفیل اتنا نہ تھا جتنا ان کی ذاتی خوبیوں کی بنا پر ٭

حکومتِ ہند کے تین سب سے اونچے مناصب (صدر، نائب صدر اور وزیرِ اعظم)

اس وقت تین ایسی جامع حیثیات شخصیتوں کے ہاتھ میں تھے جو مسلمہ طور پر ہندوستان کے بہترین قدیم وجدید کا سنگم اور تہذیب و شائشتگی، علم وفن، فکر ونظر اور نصب العین و روایات کی امین وعلمبردار تھیں، جن کو بحیثیتِ مجموعی ہندوستان کا ضمیر کہا جا سکتا ہے۔ یقین سے نہیں کہہ سکتا پھر بھی یہ بات ذہن میں آئی ہے کہ اس وقت شاید ہی کسی اور ملک کے سب سے اونچے تین عہدہ دار ان تینوں کی مساوی حیثیت کے ہوں۔ ان کو کسی دوسرے ملک کا بڑے سے بڑا آدمی بھی بڑا مانے بغیر نہ رہے گا۔

کبھی دلّی جانا ہوتا ہے تو وہاں کا اژدہام، شوروغل، ننگ وناز، شان و شوکت، عیش وطرب، کارخانے، طرح طرح کے خوبصورت اور قیمتی سامانوں سے لبریز دکانیں، نئی پرانی عمارتیں، روشنی، شاہراہیں، ہوٹل، سرکاری ایوانات، تعلیم گاہیں، سینما گھر، سفارتخانے اور سیر گاہوں کے ساتھ ناداری و نامرادی، جہالت، بیماری، گندگی، جرائم وفتنہ وفساد کا کاروبار پھیلا دیکھ کر ڈرنے لگتا ہوں کہ کہیں کھو نہ جاؤں، کوئی گرفتار نہ کرلے، ٹیکسی یا ٹرک کچل نہ ڈالے یا زندہ باد و مردہ باد کے نعروں میں عقل، نقدی یا آبرو نہ کھو بیٹھوں!

پہلے کبھی جانے کا اتفاق ہوتا تو باوجود ہلچل اور ہنگامے کے دہلی کی تاریخی عظمت اور اس کا تہذیبی وقار جسم وجان پر اس طرح سایہ فگن ہوجاتا اور برابر رہتا کہ کسی وقت کہیں آنا جانا ہوتا تو غیر شعوری طور پر یہ محسوس ہوتا رہتا کہ دہلی کو ہم نذرِ عقیدت پیش کر رہے ہیں اور وہ ہم کو ان تمام نوازشوں سے بہرہ مند کر رہی ہے جو صرف وہی کر سکتی تھی۔ دلّی کی طرف سے اب وہ اطمینان نہ رہا۔ دلّی اتنی بڑھ اور بدل چکی ہے کہ وہ ہم کو اب کسی طرب وطمانیت یا افتخار کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ دلی مبہوت ہے۔ وہ اپنے کو بھلا چکی ہے۔ کبھی دل پریاس

کا غلبہ ہوتا ہے تو خیال آنے لگتا ہے کہ قدیم الایام سے دلّی تاراج اور آباد ہوتی رہی ہے۔ اب جبکہ وہ آباد ہونے سے تاراج ہوئی ہے دیکھئے کیا ہوتا ہے؟

لیکن دراصل کہنا یہ ہے کہ ادھر کبھی دلّی جاتا تو پنڈت جی، صدر اور نائب صدر کے برسرِکار ہونے سے ایک طرح کا بھروسہ رہتا کہ ان کے اثر سے دلّی کے رہنے بسنے والوں میں شہری اور اخلاقی ذمہ داری کا اتنا شعور ضرور راسخ ہوگیا ہوگا کہ کسی کی آبرو یا جان و مال کو نقصان نہ پہنچایا جائے، نہ پہنچنے دیا جائے۔ یہ بھروسا جتنا قدرتی ہے اتنا ہی مبارک ہے۔ اپنے سے بڑے اور بالآخر سب میں بڑے میں اعتقاد اور اس پر اعتماد ہی تو انسانی شرف و سعادت کا باعث ہوا ہے۔ پنڈت جی کے اُٹھ جانے سے اس بھروسے میں فرق آگیا۔

پنڈت جی کی وفات پر جس شدّت سے سارے ملک میں اور اس سے باہر بھی اظہار رنج و غم کیا گیا اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ وہ "محشرستان بے قراری" اب کسی قدر ماند پڑ چکا ہے۔ حادثہ کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو، نفس اپنے تقاضوں سے بے پروا رہنے کی کسی کو زیادہ مہلت نہیں دیتا۔ قومی پیمانے پر جو سوگ منایا جاتا ہے اس کے پیچھے ایک مقصد ہوتا ہے یعنی جس شخص یا سانحے کا ماتم منایا جائے اس کی بازیافت یا تلافی کے لئے قوم ایک نئے عزم کے ساتھ اپنی پوری اخلاقی و تعمیری صلاحیتوں کو برسرِکار لائے، ورنہ "ماتم برائے ماتم" تو "ادب برائے ادب" سے بھی زیادہ فعل عبث ہے۔ اگر اس اظہار اندوہ و الم میں قوم اور ملک کی بھلائی اور برتری کے لئے ہم سب کی دلیری، دانشمندی اور دردمندی بھی شامل ہے تو پنڈت جی کی وفات ہمارے لئے ان کے "ظہورِ نو کی بشارت" ہے۔

پنڈت جی کی حیات میں ان کے ؎

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم   گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا دشوار تھا۔ اب یہ کام آسان ہے اور ہماری فوری توجہ کا مستحق۔ موجودہ مرکزی کابینہ میں پنڈت نہرو جیسی مبہوت کر دینے والی کوئی دوسری شخصیت نہیں ہے اور یہ اچھا ہے۔ ایسی شخصیتوں کا صرف گاہے بگاہے نمودار ہونا بہتر ہوتا ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ موجودہ حکومت سر جوڑ کر کام کرنے والوں کی ایک مضبوط اور قابلِ قدر ٹیم ہے جو متفقہ سوجھ بوجھ، متفقہ ذمہ داری، متفقہ پامردی اور عام رواداری و انسانیت دوستی کو پیش نظر رکھ کر کام کرنے پر آمادہ ہوئی ہے۔ کام میں دیر لگے گی۔ عزّت، اعتبار اور عبادت کے کاموں میں بھی دیر لگتی ہے ؂

پنڈت جی کو کانگرس کے مسلک سے علیٰحدہ کر کے دیکھنا ہمارے آپ کے لئے مناسب و ممکن ہو یا نہیں، عوام ان کو اسی طرح دیکھتے تھے۔ یوں بھی آدمی، آدمی کو پہلے دیکھتا ہے، اس کے مسلک اور مشن کو بعد میں۔ ہندوستان کے بیشمار عوام نے شروع سے اب تک کانگرس کو اتنا جانا اور پہچانا نہیں جتنا اس کے لیڈروں کو، جن میں سب سے سربرآوردہ اور ایک نا معلوم مدّت تک عزّت و محبّت سے یاد رکھے جانے والے مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو ہیں۔ ہر جنرل الیکشن میں اس بات کا واضح طور پر اظہار ہوتا کہ بحیثیتِ مجموعی عوام جتنے پنڈت جی کے فدائی ہیں اتنا پنڈت جی کے مسلک سے واقف ہیں نہ اُس مسلک کے شیدائی!

پارٹی کی کامیابی کا انحصار زیادہ تر لیڈر کی شخصیت پر ہوتا ہے۔ خاص طور پر ایسے ملکوں میں جہاں آزادی نہ ملی ہو یا آزادی ملے زیادہ دن نہ گزرے ہوں۔ یہ بات جتنی قدرتی ہے اتنی ہی آگے چل کر اندیشہ ناک بن جاتی ہے۔ کانگریس کو آخری دو لیڈر یکے بعد دیگرے ایسے ملے کہ عوام اور خواص دونوں کی نگاہیں ان پر

جم کر رہ گئیں۔ اس طرح کانگریس کے بنیادی مقاصد کو سمجھنے اور اس پر ایمان لانے کی طرف سے لوگ غافل ہو گئے۔ پنڈت جی کی وفات سے دفعتہً ایسا خلا پیدا ہو گیا جس پر قابو پانا آسان نہیں ہے۔ اِس خلا کو پُر کرنے کے لئے معلوم نہیں کس کس سمت سے طوفان کے کیسے کیسے جھونکے اور جھٹکے آئیں۔ ایسے میں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ پنڈت جی اپنے مزاج کے اعتبار سے مہاتما گاندھی کے اتنے نمائندہ نہ تھے جتنا کانگرس کے۔ پنڈت جی کے بعد کانگرس کی قیادت ایسے ہاتھوں میں آئی جس کا جھکاؤ گاندھی جی کے مسلک کی طرف ہے۔ اتحاد نہ ہوتا تو شاید پنڈت جی کا جانشین منتخب کرنے میں وہ اتفاقِ رائے اور اتحادِ خیال میں نہ آتا جو آیا اور یہ صورتِ حال یقیناً نیک فال ہے۔ ہندوستان تاحال اور اخلاقی قدروں پر ایمان رکھتا آیا ہے جس کو سب سے بڑی تائید مہاتما گاندھی کی قیادت سے ملی۔ پنڈت جی کا طریقِ فکر اور طرزِ عمل نژادِ نو اور جہانِ نو کے تقاضوں سے ہم آہنگ تھا۔ یہ نہ کوئی نئی بات ہے نہ ڈرنے کی بات ہے صرف ساز و ستیز کا مسئلہ ہے۔

پنڈت جی کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے سرمایہ فراہم کیا جائے گا، یہ رقم کروڑوں تک پہنچے تو عجب نہیں۔ سمجھدار اور وسیع النظر اصحاب سوچ بچار کر اس رقم کو رفاہِ خلق کے کاموں پر صرف کرنے کے پروگرام بنائیں کہ جس سے بڑے وسیع پیمانے پر ہر چھوٹا بڑا فائدہ اُٹھائے گا۔ ملک کے خیر و برکت کے سرچشموں میں اضافہ ہو جائے گا لیکن صرف اتنا کر دینے سے مہاتما گاندھی اور پنڈت جی کی یاد کو قائم رکھنے کا مقصد پورا نہ ہوگا۔ چھوٹے بڑے لیڈروں کی چھوٹی بڑی بندھی ٹکی یادگاریں تو قائم ہوتی رہتی ہیں ان کے کارآمد ہونے میں بھی شک نہیں۔ لیکن رفاہ عام کے پروگرام اچھی اور نمائندہ حکومتیں یوں بھی بناتی اور نافذ کرتی رہتی ہیں۔ یہ ان کے فرائض

ہے۔ اگر ان میں دو چار کا اضافہ ہو گیا تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

جیسی یادگاریں قائم کرنے کا ہمارے یہاں دستور ہے۔ اس میں ایک بڑا خطرہ یا فریب یہ مضمر ہوتا ہے کہ یادگار قائم کر کے ہم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ محبت و عقیدت کے اظہار یا طعنِ اغیار سے بچنے کا اس سے زیادہ شاندار نمونہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ مرنے والے کی روح شانت ہو گئی، پبلک کا حوصلہ اور اپنا مقصد پورا ہو گیا۔ ایسے لوگوں کو کس طرح سمجھایا جائے کہ اس نیت سے یادگار قائم کرنا نالائقی حماقت یا فعلِ عبث ہے۔ مرنے والے کی زندگی میں اس کے مشن کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری ہم پر اتنی عائد نہیں ہوتی جتنا اس کے مرنے پر اس کی یادگار کو صحیح خطوط پر قائم کرنے اور اس کو بامقصد و بار آور بنانے سے بڑھ جاتی ہے۔ پنڈت جی کی یادگار ایسی قائم ہونی چاہئے جس سے اتنا ان کا نام نہیں جتنا اُن کا کام زندہ رہے اور آگے بڑھایا جاسکے۔ کسی کی یاد پر رائے شماری کے کاغذ پر درج کئے ہوئے اس کے نام کو چپکا دینے سے کام نہیں چلتا۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مہاتما گاندھی اور پنڈت جی کی یادگاریں ڈھیرے کی نہ ہونی چاہئیں، سارے ہندوستان میں عالیشان سے عالی شان جتنے پہاڑ، دریا، شہر، پانی کے بند، باغات، جنگل، تعلیم گاہیں، عمارتیں، شاہراہیں وغیرہ ہیں ان کے ناموں کے بجائے مہاتما گاندھی اور پنڈت جی کے نام رکھ دیئے جائیں تو اس سے ان سرداروں کی بڑائی میں کوئی اضافہ ہوگا، نہ اُن پہاڑوں، دریاؤں اور عمارتوں کے مصرف میں۔ فرض کیجئے ہندوستان کو آج سے گاندھی نہرو استھان کہنے لگیں تو اس سے ہماری آپ کی مشتبہ ذہنیت میں کیا فرق آجائے گا جس کی اصلاح میں ان عظیم شخصیتوں نے کیا کیا نہ کر ڈالا لیکن ہم جہاں کے تہاں رہے۔

مہاتما گاندھی اور پنڈت جی نے ہمارے بطون میں اس لئے انقلاب نہیں

پیدا کیا کہ ہمالیہ کا نام گاندھی یا نہرو رکھ دیا جائے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ہم میں انسانیت آئے اور ہم انسان بنیں، جبر و جہالت کے خلاف جہاد کریں۔ در ندگی سے نیکی کی طرف آئیں اور زندگی کو بلند اور بابرکت بنانے میں اور ان مقاصد کے حصول میں "تسلیم جاں" سے بھی دریغ نہ کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کے نام پر جو سرمایہ فراہم کیا جائے یا کیا جا چکا ہے اس کا ایک معقول حصّہ ایسی تدابیر کے بروئے کار لانے پر صرف کیا جائے جن سے ہندوستان کے نوجوان اس طرح کی تربیت حاصل کریں اور اس کا حلف لیں کہ وہ اپنے خیال لفظ اور عمل سے مہاتما گاندھی اور پنڈت جی کی بیش بہا خدمت تا عمر روشن رکھیں گے۔ اس اسکیم کو اسی تندہی سے نافذ کرنا چاہئے جس سے ناگہانی حالات میں نوجوانوں کے لئے فوجی تربیت لازم کر دی جاتی ہے۔

مادی خوش حالی اور بے قید سیاسی آزادی کے ساتھ اخلاقی گراوٹ بھی برابر سامنے آرہی ہے۔ مہاتما گاندھی اور پنڈت جی کے احترام میں مخصوص قسم کی یادگار قائم کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ ہمارے نوجوان اُن اخلاقِ فاضلہ سے بہرہ مند ہوں جن کا سرچشمہ یہ برگزیدہ ہستیاں رہی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یادگاریں بڑھتی جائیں اور گاندھی نہرو گھٹتے جائیں۔ صنعتی ترقی اور مادی خوشحالی کے لئے ہندوستان کو بیرونی طاقتوں سے اربوں روپے مل سکتے ہیں لیکن یہ حکومتیں کسی قیمت پر بھی ہمارے لئے گاندھی اور نہرو نہیں فراہم کر سکتیں۔ یہ کام تو ہمارے ہی ملک کو کرنا پڑے گا۔ اگر ہندوستان نے اپنے لئے بھی گاندھی اور نہرو کی بازیافت نہ کی تو اس سے زیادہ بدنصیب ملک اور ہم سے زیادہ منافق کوئی دوسری قوم نہ ہوگی۔

پنڈت جی نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی وہ مشترک خاندان، مشترک

جائداد اور ایک مشترک و مستقل روایات کا معاشرہ تھا جسے مشرق اوسط اور ہندوستان کی ملی جلی تہذیب نے پروان چڑھایا تھا۔ شمالی ہندوستان کے بیشتر شہری یا قصباتی باشندوں پر اس تہذیب کا تصرف عام تھا۔ پنڈت جی کے گھرانے پر مغربی تربیت و تہذیب کا اثر بھی کافی تھا۔ اس طور پر یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ پنڈت جی علیٰ قدرِ مراتب تین تہذیبوں کے ساختہ پرداختہ تھے۔ ہندی ہند ایرانی اور مغربی۔ پنڈت جی کی زندگی میں انقلابات آتے رہے لیکن ان تہذیبوں کا اثر تا دمِ آخر ان پر رہا۔

اس ہند ایرانی معاشرے میں گھر کا بڑا خاندان کی پرورش و پرداخت، صحت و عافیت، تعلیم و تربیت، اخلاق و عادات، ننگ و ناموس، روزی روزگار شادی بیاہ، سب کی دیکھ بھال رکھتا اور بڑی حد تک ان کو پورا کرنے کرانے کا ذمہ دار ہوتا، سب اس کے دست نگر ہوتے، کوئی آفت ارضی یا سماوی پیش آجائے تو خاندان کا شیرازہ نہیں بکھرنے دیتا تھا۔ ہر خاندان کے بڑے کا دوسرے خاندان والوں پر یکساں اچھا اثر ہوتا۔ اس میں مذہب، ذات پات، رشتہ ناتا کسی کی قید نہ تھی، یہاں تک کہ نچلے طبقے کے گھرانے کا کوئی بڑا یا بزرگ ہوتا تو اس کے سامنے اعلیٰ طبقے کے نوجوان کو بھی آنکھیں نیچی رکھنی پڑتیں، سوسائٹی کی تقسیم مذہب اور دولت کی بنا پر اتنی اہم نہ تھی جتنی خاندان کے نمائندے اور بزرگ ہونے کی حیثیت سے۔

آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے گاؤں یا قصبے میں کوئی واردات ہو جاتی تو بستی کے بڑے بوڑھوں کی متفقہ رائے سے طے پا جاتی۔ اس میں وہ اس ایمان داری اور دلیری سے حصہ لیتے جیسے معاملہ کسی خاص فرد یا خاندان کا نہ تھا، بلکہ پوری بستی کی آبرو کا سوال تھا۔ اس کا بالکل لحاظ نہ کیا جاتا کہ کون

برہمن ہے، کون ہریجن، کون ہندو ہے کون مسلمان، کون اپنا ہے کون پرایا۔ مشترک خاندان اور خاندان کی لیڈرشپ کا وہ نظام ختم ہوگیا۔ بُرا رہا ہو یا بھلا اس میں کون پڑے یہ ضرور ہے کہ ایسا ہونا ناگزیر تھا۔

پنڈت جی بڑے عالی نسب، متمول، روشن خیال، ذی اقتدار ذی علم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ قوم کی خدمت میں چاہے وہ آگ سے خاک اور خاک سے خاکستر کیوں نہ ہو گئے ہوں اگر وہ یونان کے اس دور میں ہوتے جب غیر معمولی استعداد وصفات کا آدمی دیوتا کے درجے پر فائز کر دیا جاتا تھا تو وہ یقیناً کوئی دیوتا یا نیم دیوتا قرار دیئے جاتے۔ جس معاشرے میں وہ پلے اور بڑھے اس میں ہر چھوٹا اپنی ضرورت خاندان کے بزرگ سامنے لاتا، اس کی تائید حاصل کرتا یا اس کے مشورے پر عمل کرتا۔ پنڈت جی وزیرِ اعظم ہوئے تو ان کے جاننے پہچاننے اور ان سے محبت کرنے والوں کی تعداد شمار اور اندازے سے باہر ہو چکی تھی۔ سب ان کو اتنا وزیرِ اعظم نہیں جانتے تھے جتنا گھرانے کا بزرگ مانتے تھے، اس لئے سب اپنی اپنی معمولی اور غیر معمولی ضرورتیں اور مصیبتیں لے کر پنڈت جی تک پہنچنے کی فکر میں رہتے، پہنچ جاتے اور مطلب براری ہوتی یا نہیں، تقویت کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ پنڈت جی موجود ہیں، کام بنے گا نہیں تو بگڑنے بھی نہ پائے گا۔ ان لوگوں کی دارسی کے لئے کتنے ہی ادارے کھول یا عہدہ دار مقرر کر دیئے جاتے۔ پنڈت جی تک پہنچے بغیر وہ کبھی مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔

اس خاص اعتبار سے مہاتما گاندھی کو بھی وہ حیثیت حاصل نہیں تھی جو پنڈت جی کو تھی۔ مہاتما جی تو نصیحت کرتے، تسکین دیتے یا راضی برضائے الٰہی رہنے کی تلقین کرتے۔ غرض مند کا کام اتنے سے نہیں چل سکتا تھا۔ وہ تو

روزی اور روزگار کا خواستگار ہوتا یا چاہتا کہ اُسے کسی جابر کے ظلم سے نجات دلائی جائے، یہ کام صرف پنڈت جی کر سکتے جس کو کس تندہی سے کتنے دنوں تک کتنی دشواریوں میں رہ کر انھوں نے برابر انجام دیا، یہاں تک کہ جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔

دوسرے ملکوں کا علم نہیں، ہندوستان میں جس لیڈر کو پنڈت جی کی طرح ہر شخص کے بڑے اور بزرگ ہونے کا امتیاز حاصل نہیں وہ پارٹی کا لیڈر تو ہو سکتا ہے پورے ملک اور باشندوں کا سردار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جہاں تک زیادہ سے زیادہ لوگوں کی انفرادی دشواریوں کو دُور کرنے کا تعلق ہے ہندوستان کے لیڈروں میں پنڈت جی کا کوئی ثانی نہیں اور یہ اس روایت کی بنا پر تھا جس میں پنڈت جی پیدا ہوئے، پلے اور جو اُن کی سیرت کا جز بن چکی تھی۔ وہ روایات اب ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی ہیں، آئندہ کی لیڈر شپ میں یہ کمی محسوس ہوا کرے گی۔ یہ اچھا ہو گا یا بُرا، کون جانے!

شروع سال رواں میں پنڈت جی دفعتہً علیل ہوئے، ہندوستان ہی نہیں مہذب دُنیا کے ہر گوشہ میں جہاں جہاں اُن کے جاننے والے موجود تھے یہ خبر سُن کر مضطرب ہوئے لیکن تعجب کم لوگوں کو ہوا ہو گا اس لئے کہ مختلف النوع ذمہ داریوں کے کام پنڈت جی دن رات میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے انتہائی انہماک کے ساتھ بغیر آرام کئے جس طرح انجام دیتے تھے جو مدتوں سے اُن کا معمول چلا آتا تھا وہ ان کی عمر کے چار پانچ آدمی بھی متفقہ طور پر انجام نہیں دے سکتے۔ یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ پنڈت جی سے زیادہ مصروف اور طرح طرح کی بھاری ذمہ داریوں سے گرانبار دنیا میں شاید ہی کوئی دوسرا ملے، خواہ وہ کسی حکومت کا سربراہ ہو یا کسی اور ادارے کا۔ احتیاط و علاج سے طبیعت سنبھل گئی تھی لیکن نہ اتنی کہ وہ جس تندہی اور فیصلہ کن انداز سے پہلے کام کرتے تھے۔ اس کی متحمل ہو سکتی، دوسری طرف ذمہ داری کے کاموں کی نوعیت اور مقدار بڑھتی رہی۔

بایں ہمہ جس ہمت و بشاشت سے وہ اپنے فرائض انجام دیتے رہے وہ انھیں کا کام تھا۔

اخبارات اور دیگر ذرائع سے پنڈت جی کی صحت، سرکاری کاموں میں مصروفیت اور جلسوں اور تقریبوں میں شرکت کا حال معلوم ہوتا رہتا۔ چہرے بشرے سے جس مستعدی، شرافت اور ذہانت کا اظہار بیماری سے پہلے تمام عمر ہوتا رہا، وہ اب بھی باقی تھی لیکن واضح طور پر یہ بھی دکھائی دینے لگا تھا جیسے اُن پر خاموشی اور بے بسی کا ایک سایہ پڑنے لگا ہو جو روز بروز گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ان کی آنکھیں جو ہمیشہ ہمت اُمید اور دلنوازی سے روشن رہتیں اور دوسرے کے دل کو حوصلے سے گرماتی رہتیں، اب کسی گہری سوچ میں اُفق سے پار، خاموش ناقابلِ فہم لامحدود پہنائیوں میں گم رہنے لگی تھیں۔

کون جانے وہ کس سوچ میں ڈوبے رہتے تھے۔ زندگی کا وہ نقشہ سامنے آتا ہوگا جسے پیشِ نظر رکھ کر تمام عمر کام کرتے رہے، کیسے کیسے احباب کی تائید اور اشخاص کی مخالفت حصّے میں آئی، فتح و شکست کی کن منزلوں سے گزرنا پڑا، ملک اور قوم کو کتنی عزت و آسائش نصیب ہوئی۔ آئندہ کے لئے کیا کرنا ہے۔ وہ آئندہ جو گزشتہ سے زیادہ اہم اور پیچیدہ، اس لئے ساتھیوں کے بے لوث تعاون کا طلب گار تھا۔ خود اپنی اُس ہمت اور استعداو کار کا بھی جو عمر اور صحت کے اعتبار سے روز بروز مضمحل ہوتی جا رہی تھی، غیر متوقع گوشوں سے مخالفت کا عفریت سر اُٹھا رہا تھا، اپنے بھی پرائے ہوتے جا رہے تھے۔ ان تمام دشواریوں پر قابو پا لینا ناممکن نہ تھا لیکن کیا کیا جائے کہ زندگی کی شام جس تیزی سے بڑھتی آ رہی ہے جسم و جان کی توانائی اسی اعتبار سے گھٹتی جا رہی ہے۔

یہ باتیں یونہی ذہن میں نہیں آ رہی ہیں کچھ دن ہوئے ایک اخبار[1] میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اُس اجلاس کی رپورٹ نظر سے گزری جو پنڈت جی کی موجودگی میں بمبئی میں منعقد ہوا تھا۔ جستہ جستہ اقتباسات درج ذیل ہیں:

---

[1] دورِ حیات، بمبئی کا ہفتہ وار اخبار (۲۰ مئی و یکم جون ۱۹۶۴ء) جلد ۳ شمارہ ۱۴، ۱۵

"اکبر الہ آبادی نے دلی کا کاروبار دیکھا تو ایک لاجواب نظم رقم کردی۔ امسال ۱۵ سے ۱۷ مئی تک آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے جلسے بمبئی میں ہونے لگے تو میر خوار[۵] نے سوچا کیوں نہیں اپنی سرکار کا دربار بھی دیکھ لیں! شہر کے جنوبی حصے میں بیس لاکھ کے خرچ سے بنے ہوئے شانمکھنڈ ہال میں جلسے ہو رہے تھے لیکن دقت یہ تھی کہ مئی کی گرمی، تقریباً تین ہزار کا مجمع اور ہال "ایرکنڈیشن کی نعمت سے محروم" پنکھوں کی تعداد دو چند کر کے بھی کوئی فائدہ نہ ہونے والا تھا اس لئے مجلس استقبالیہ نے تین سو ٹن برف کی سلیں لا کر فضا میں خنکی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ پھر کچھ منچلوں کو سوجھی کہ وقفے وقفے سے گلاب کے عرق کی خوشبو پھیلا کر ہال کو معطر کیا جائے تا کہ خنکی میں لطافت بھی پیدا کی جا سکے۔ ہال اور اسٹیج کی سجاوٹ میں بڑی سادگی تھی۔ بید لرزاں کے پیچ و خم اور رنگین کپڑوں کے ٹکڑوں سے جمنی رائے نے اپنے مخصوص اسٹائل کے آرٹ کے خاص پیارے نمونے پیش کئے تھے لیکن اتنی ہی بدمذاقی مہاتما گاندھی کی اس ٹوٹی ہوئی تصویر سے ٹپک رہی تھی جو کٹری سی عقب میں کھڑی تھی۔ ٹھیک بارہ بجے دن کو وزیر اعظم، صدر کانگرس، ارکان ورکنگ کمیٹی، گورنر مہاراشٹر، وزرائے حکومت وغیرہ کہکشاں کی طرح اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ جلسہ میں آنے والوں کے لئے موٹر پارک کرنے کا بڑا معقول انتظام تھا۔ ایک فرلانگ تک موٹروں کا اژدحام تھا اور وہ بھی کیسی کیسی شاندار موٹریں! میر خوار دل میں سوچنے لگا: کیا یہ اُسی گاندھی کی کانگرس ہے جس نے کُرتہ پہننا اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ اس دیش کے کروڑوں باشندے اس کے بغیر زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے یا اس باپو کی جماعت ہے جو سیوگرام جھونپڑی میں رہا کرتا تھا کیونکہ اس کے ہم وطنوں کو اس سے بہتر جگہ میسر نہ تھی؟ کیا اس کانگرس کی شان و شوکت، تزک و احتشام، امریکن کنونشن سے کچھ کم تھی؟ اس فضا اور اس ماحول میں بیٹھ کر غربت، مفلسی اور سوشلزم وغیرہ کی باتیں کچھ بے جوڑ سی لگتی تھیں۔ غربت اور غریبی پر کرشنا مینن نے ایک بلیغ جملے میں اظہارِ خیال کیا: "ہندوستان غریب نہیں ہے، ہندوستانی غریب ہیں۔" وسیع اسٹیج پر بیشمار

۵ نامہ نگار کا فرضی نام جس کے لئے وہ داد کے مستحق ہیں۔

تکیے پڑے ہوئے تھے۔ آسمانِ سیاست کے بیشمار درخشندہ ستارے آتے گئے اور بیٹھتے گئے۔ ان میں جواہر لال نہرو اور صدر کامراج کے علاوہ وجے لکشمی پنڈت، مرارجی ڈیسائی، جگ جیون رام، لال بہادر شاستری، سردار سورن سنگھ، غلام محمد صادق، یشونت رائے چوہان، وسنت رائے نائک، اندرا گاندھی، ایس کے پاٹل، گلزاری لال نندہ، سچیتا کرپلانی، کرشنا مینن وغیرہ۔ غرض ڈراما یا سینما کی اصطلاح میں "آل سٹار کاسٹ" تھا.... میر خوار کو یقین تھا کہ کانگرس جیسی وقیع جماعت کے اجلاس میں اسٹیج پر وقار اور سنجیدگی ہوگی۔ ایسے اجلاس جس میں ہمارے چوٹی کے سیاسی رہنما ڈسپلن تہذیب اور اخلاق کے معلمین، حکومت کے وزرا اور دوسرے عمائدین جمع ہوں، ایسے اجلاس جن کی کارروائی دیکھنے اور سننے کے لئے نہ جانے کتنے غیر ملکی صحافی اور نمائندے اور مدبرین جمع ہوں، کم از کم یہاں تو ایسی باتیں نہ ہوں گی جن سے ہماری تہذیب پر حرف آسکتا ہو۔ مگر افسوس کہ یہاں بھی مایوسی ہوئی۔ یہاں بھی لوگ چار چار پانچ پانچ کی ٹولیوں میں تقسیم ہو کر حلقہ بنا بنا کر اس طرح بیٹھ گئے جیسے اسکول کے میدان میں ڈرل ماسٹر بچوں کو کھیل کھلانے کے لئے بٹھا دے۔ کسی کا منہ دکھائی دے رہا ہے تو کسی کی پیٹھ، مندوبین تجویز پر تقریر کر رہے ہیں اور ٹولیاں اپنی اپنی گفتگو میں مصروف و مشغول..... اسٹیج پر بیشمار تکیے رکھے تھے۔ پہلے تو یہ سب قرینے سے لگے تھے لیکن جیسے جیسے لوگ آتے گئے ان کی ترتیب میں فرق آتا گیا اور تھوڑی دیر میں ان کے طریقہ استعمال میں بھی خاصا اختلاف دکھائی دینے لگا کوئی تکیے سے لگا ہوا تھا اور کوئی تکیہ پر بیٹھا تھا۔ یورپ میں لوگ "بستر میں" سوتے ہیں اور ہندوستان میں بستر "پر" کچھ ایسا ہی معاملہ یہاں بھی تھا۔ کرشنا مینن اپنی جادو کی چھڑی سے کبھی تکیے کو گھسیٹتے دکھائی دیئے اور کبھی بازو میں رکھے ہوئے جوتے اور چپلوں کو۔ گویا ایک مداری کی طرح انھوں نے اپنی چھڑی سر سے پیر تک پھرا دی!..... سیشن کا ایک اہم پہلو بیمار نہرو کی شرکت تھی۔ میر خوار کے نیاز مند میں اہمیت اس بات کی تھی کہ ہندوستان کے ہر علاقے اور ریاست سے آئے مندوبین نے اپنی آنکھوں سے وزیر اعظم کا آنا جانا اور اٹھنے بیٹھنے کا تکلیف دہ

منظر دیکھا کہ بھبنیشور کی علالت کے بعد سے اب تک اُن کے محبوب جواہر لال کی صحت کس منزل پر ہے۔ ان کے منہ سے دبے دبے فجائیہ الفاظ ان کے جذبات کی غمازی کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ان کے دل میں نہ جانے کیا کیا باتیں آ رہی ہوں!! اور میرخوار نے اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ وہ منظر دیکھا۔ کئی موقعے ایسے آئے جبکہ کافی دیر تک وزیر اعظم تکیہ کا سہارا لگائے یکہ و تنہا خاموش بیٹھے رہے اور دس دس فٹ کے فاصلے تک ان کے پاس فرد واحد بھی دکھائی نہ دیا اور جو اس فاصلے پر بیٹھے بھی تھے۔ ان میں سے بہتوں کی پیٹھ جواہر لال نہرو کی طرف تھی۔ وہ آپس کی گفتگو میں اس طرح مصروف تھے جیسے وہاں پر جواہر لال کا وجود نہیں کے برابر ہو۔ آخر اس "بے رُخی" اور سرد مہری کے کیا معنی.....!"

یہ وہ پنڈت جی ہیں جن کی ایک نگاہ غلط انداز سے ممتاز و مفتخر ہونے کے لئے "صبرِ ایوبؑ کیا، گریۂ یعقوبؑ کیا" کی نوبت آجایا کرتی تھی یا جس کی گرم نگاہی سے کیسے سورماؤں کا پتا پانی ہوتا تھا۔ آج وہی پنڈت جی کہاں، کس حال میں تھے اور غاشیہ برداران موکب اجلال کہاں، کس تفریح سے لطف اندوز ہو رہے تھے ع

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

یہ سب دیکھتے ہوئے دل میں بے اختیار یہ بات آئی، کاش پنڈت جی بیمار نہ ہوئے ہوتے یا اتنے دنوں تک علیل نہ رہتے یا پھر کلیتہً صحت یاب ہو جاتے۔ ایسی شخصیتوں کو جیسی کہ پنڈت جی کی تھی طویل المیعاد اور بالآخر جان لیوا آزار میں مبتلا نہ ہونا چاہئے۔ ایسوں کے مدّتِ مدید تک مریض و معذور رہنے سے وہ سارا انظام ماؤف و ابتر ہو جاتا ہے جس کے وہ معمار و مختار رہ چکے تھے۔ اس لئے کہ وہ منافق و مفتری جو اپنے نامبارک اغراض کی خاطر لیڈر کی چھتری کے نیچے پناہ گزیں ہوتے ہیں، موقع ملنے پر سب سے پہلے اپنے محافظ و مربّی سے منحرف ہو کر اس کے نام اور کام کو داغدار کرنے اور اپنے مقاصد کو آگے بڑھانے میں سرگرمِ عمل ہو جاتے، چنانچہ جو کام ملک اور اس کے باشندوں کے نفع و ناموری

کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ سیاسی شخصیتوں اور اخلاقی شخصیتوں میں کتنا تفاوت ہوتا ہے! پہلا عوامل طبیعی کی زد میں جتنا درماندہ ہوتا رہتا ہے مؤخر الذکر اتنا ہی برگزیدہ!

پنڈت جی خدا یا مذہب کے قائل نہ تھے۔ اس کا وہ آخر وقت تک کبھی کبھی بے ضرورت بھی اظہار و اعلان کرتے رہے۔ وصیت نامے میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ جتنی اور باتیں جس بصیرت و درد مندی سے کہی ہیں وہ جیسے دل میں اُتر کر رگ و پے میں نفوذ کر جاتی ہیں، پنڈت جی نے جیسے یہ باتیں کہی نہ ہوں بلکہ خود ان کی پوری زندگی وصیت نامے کی ان سطروں میں سمٹ کر آگئی ہو، اور ہم چاہیں تو حواسِ خمسہ کی ہر حس سے پنڈت جی کو جان اور پہچان لیں۔ کوئی اُن سے واقف نہ ہو جب بھی اس تحریر کو پڑھے گا غائبانہ ان سے محبت کرنے لگے گا اور اپنی نظروں میں اپنی بڑائی بھی محسوس کرے گا۔

پنڈت جی کی غریبوں سے محبت، مظلوموں کی حمایت، حق کی تائید، خلق اللہ کی بھلائی اور ترقی کو اپنی زندگی کا شیوہ بنا لینا ایسی باتیں نہیں ہیں جو مذہب کے قلمرو سے باہر ہوں۔ ان کی تصانیف میں آرٹ، انسانیت اور اقدارِ اعلیٰ کی حمایت کا جو آہنگ ملتا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہمارے آپ کے خدا یا مذہب پر عقیدہ رکھتے ہوں یا نہیں، اس طرح کسی نہ کسی حقیقتِ بسیط سے غیر شعوری طور پر سہی، متاثر ضرور تھے۔

وہ خدا سے چاہے جتنے دور رہے ہوں، اس کی مخلوق سے بہت قریب تھے۔ خدا سے انکار اور اُس کی مخلوق سے یہ شیفتگی، ایک سوال کی شکل میں اگر خدا کے سامنے پیش کی جا سکتی تو اقبال کی نظم "تنہائی" میں اللہ کی طرف سے جو اشارہ شاعر کو موصول ہوا یعنی

تبسمے بہ لبِ اُو رسید و ہیچ نگفت

وہی اس موقع پر بھی ایک اور ہی جہانِ معنی لئے ہوئے ملے گا!

پنڈت جی نے وصیت کی تھی کہ ان کی وفات پر مذہبی رسوم نہ بجا لائے جائیں

نعش جلادی جائے۔ اس کی خاکستر کھیتوں پر چھڑک دی جائے۔ البتہ تھوڑی سی مقدار گنگا میں بہادی جائے۔ اس لئے کہ گنگا سے اُن کو بچپن سے وابستگی رہی ہے' یہ ہدایات جس طرح دی گئی ہیں اس سے پنڈت جی کے کردار کا کتنا عظیم، حسین اور قابلِ احترام تصوّر ذہن میں آتا ہے۔ ہندوستان کی زندگی' تاریخ و تہذیب میں گنگا کا کیا رول رہا ہے۔ پنڈت جی اس کے بیان کرنے میں اپنی پوری تخلیقی صناعی' ذہنی توانائی اور تخیل کی کرشمہ کاری سے مدد لیتے ہیں۔ مذہبی صحائف میں گنگا جی کی تعریف تقدیس میں ہندوستان کے شاعروں اور رشیوں نے یقیناً عقیدت کے بے مثل نذرانے پیش کئے ہوں گے۔ لیکن پنڈت جی نے گنگا کو ہندوستان کا جیسا مظہرِ جمیل قرار دیا ہے وہ اس لئے طرفہ تر' عزیز تر اور رفیع تر ہے کہ پنڈت جی اپنے آپ کو خدا اور مذہب سے منسوب نہیں کرتے ہم ان کو بیسویں صدی کا خالص سائنٹفک اور حقیقت پسند ذہن بھی قرار دیتے ہیں' اس کے باوجود انھوں نے گنگا کی تحریم و تکریم میں جو کچھ لکھ دیا ہے کتنے اہلِ دل اور اہلِ قلم ہیں جن کے بس کی یہ بات ہے!

بہت دنوں کی بات ہے جب گاندھی جی نے اپنا مشہور انگریزی اخبار ینگ انڈیا نکالا تھا۔ خیال آتا ہے کہ کسی کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا تھا: مجھے یہ یقین نہیں آتا کہ جو شخص ہندوستان کی سرزمین سے اُٹھا ہو' وہ خدا پر یقین نہ رکھتا ہو۔!"

سنہ ۱۹۴۸ء کی ایک شام کو دہلی میں انسانیت کا ایک محسن گولی کا نشانہ بنا ٹھیک اُس وقت جبکہ وہ انتہائی مسکنت اور تضرع سے ایک طرف جابر و قاہر کو رحم اور سچائی کی طرف بُلا رہا تھا اور دوسری طرف مسکین و مظلوم کے زخموں پر اپنی محبت کا پھاہا رکھ رہا تھا دلّی لرز گئی۔ کوئی شخص خواہ کسی حیثیت کا ہو' کسی دوسرے لمحے موت کے گھاٹ اُتارا جا سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا' جیسے اُس رات کو اور کتنے دوسرے دن اور رات کو کوئی شخص اپنے گھر خیریت سے نہ پہنچ سکے گا۔ جو لوگ گھر پر ہوں گے وہ محفوظ نہ ملیں گے۔ دلّی ہی میں نہیں دور دور بھی!

اتنے میں بغیر کسی خوف و خطر کے ایک بلند مقام پر یکہ و تنہا گوشت و پوست ہی کا بنا ہوا ایک انسان مجمع میں سے اُبھرا، معلوم نہیں کتنی اندرونی طاقتوں سے محکم و مطمئن، اُس وقت اس سے زیادہ آسانی سے کسی قاتل کا شاید ہی کوئی اور نشانہ بن سکتا لیکن اس سے زیادہ شاید ہی کوئی اور موت سے بے پروا تھا۔ ایک بار پھر دلّی لرز گئی!

پھر اس نے وہ سب کہا جو کہہ سکتا تھا، اس اطمینان و یقین سے جیسے اس حادثے نے اس کی اپنی موت کو بازیچۂ اطفال بنا دیا ہو۔

وہ مہاتما گاندھی تھے، یہ پنڈت جی!

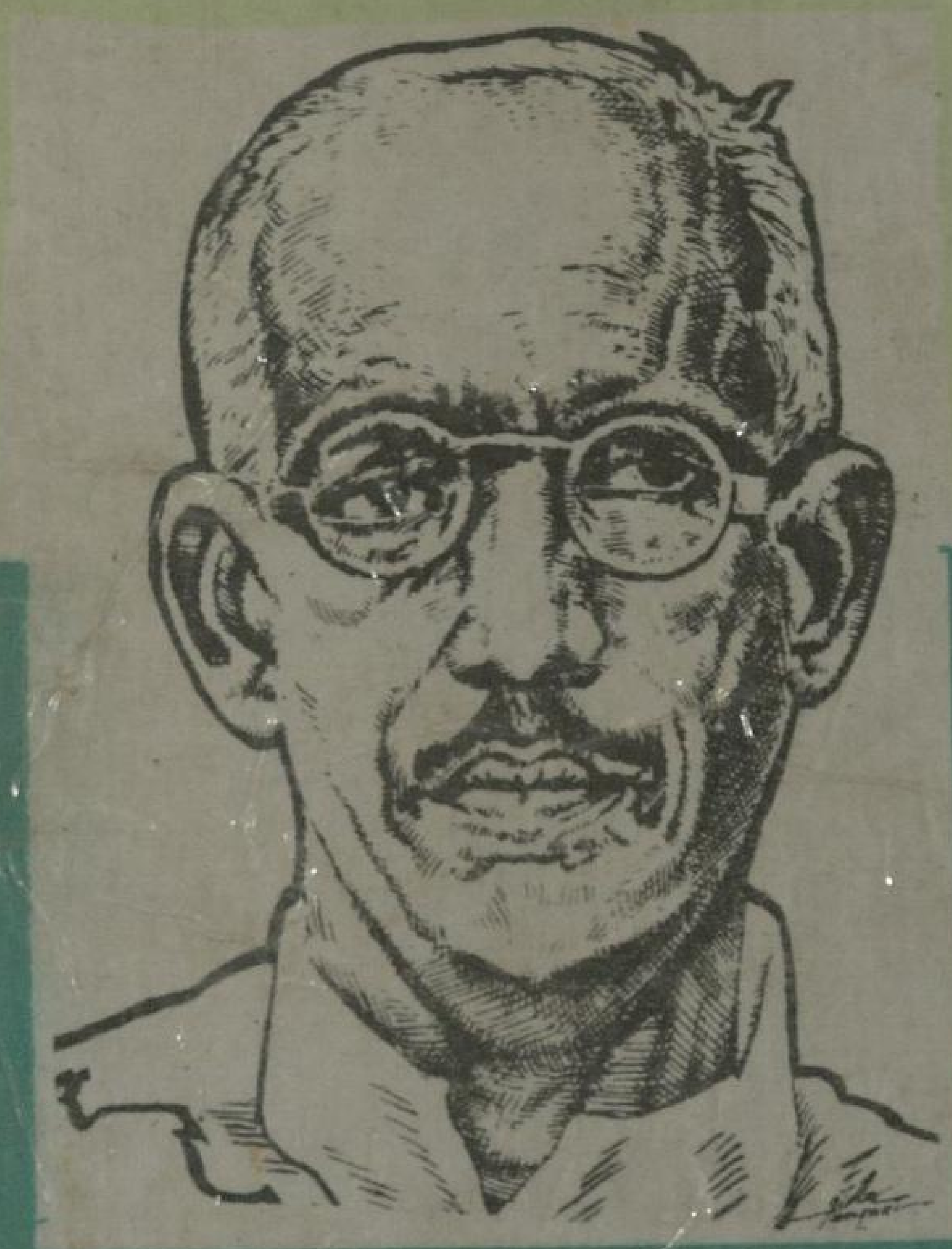
مہاتما گاندھی کی شہادت پر پنڈت جی کی اس دلیری کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ حق کی حمایت میں دلیر ہونا کس کو کہتے ہیں!

پنڈت جی کی وفات پر نہ دہلی گیا نہ کہیں اور کئی دن تک صرف اخبارات پڑھتا اور ریڈیو سُنتا رہا۔ تصوّر میں وہ نقشہ طرح طرح سے بنتا بگڑتا رہا جس کا ذکر اوپر کی سطروں میں کر آیا ہوں۔ پھر ایسا محسوس ہوا جیسے راج گھاٹ پر میّت کو نذرِ آتش کرنے کے بعد ایک صدا بلند ہوئی ع

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق

تھوڑی دیر بعد یہی صدا پھر آئی۔ صرف لہجہ بدلہ ہوا تھا رنج و راحت ہو، تنہائی ہو، محفل ہو، آبادی ہو یا ویرانہ، کہیں جاؤں کچھ کروں، یہ مصرع اپنے آپ کو دہراتا اور اپنی یاد دلاتا رہتا ہے۔ اُسی بدلے ہوئے لہجے میں، جیسے بیچ سمندر میں اچانک کوئی بہت بڑا جہاز ڈوب گیا ہو اور نبات البحر اس پر نوحہ خواں ہوں!۔

ختم شُد



ہم نفسانِ رفتہ

رشید احمد صدیقی